قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱
پوسٹ کوڈ ——— 54660
ٹیلیفون : 876219

انتظامیہ

چیئرمین بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اعزاز الدین احمد خاں
ناظم۔ محمد لطیف چوہدری

مجلسِ ادارت

حسین امیر فرہاد۔ میجر محمد یوسف ڈار۔ محمد عمر دراز

ناشر : عطاء الرحمٰن ارائیں
طابع : خالد منصور نسیم
مطبع : النور پرنٹرز و پبلشرز
2/ج فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور

مقامِ اشاعت

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور۔

جلد 47 ——— 9
ستمبر ۱۹۹۴ء

بدلِ اشتراک

سالانہ
پاکستان ——— ۱۲۰ روپے
بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر
فی پرچہ : -/۱۰ روپے

فہرستِ مضامین

لمعات	ادارہ	2
قرآن اور مسلمان	محمد مسیح الدین صدیقی	6
پاکستان کی نئی زیارت گاہیں	علامہ پرویزؒ	9
ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے	اعزاز الدین احمد خاں	30
نظم	غلام رسول ازہر	35
اکیسویں صدی اور قرآن	محمد حنیف دہدانی	36
عورت روایات کے آئینے میں	ادارہ	43
حقائق و عبر	ادارہ	49
طلوعِ آفتاب	علامہ پرویزؒ	52
اسلام میں پارٹیوں اور فرقوں کا وجود	قمر پرویز	57
اشتہار	ادارہ	61
آج کا سندھ	عامر نوی والا	62
زندگی کا حسین تصور	وزیر زادہ مردانوی	65
سائنس اور علما	علی محمد چدھڑ	67
بچوں کا صفحہ	ادارہ	73
انگریزی مضمون	اعزاز الدین احمد خاں	80

لمعات

حکومت سے ایک سوال؟

جب فرقہ سازی کو آئینی تحفظ حاصل ہے تو ختم کیسے ہو گی!

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس وقت پاکستان مکمل طور پر فرقہ واریت کی گرفت میں ہے۔ سرحد میں پاڑہ چنار کے علاقے میں ہر سال شیعہ سنی فسادات ہوتے ہیں۔ اس بار گلگت میں بھی ہوئے۔ صوبہ سندھ میں کراچی کو امتیازی مقام حاصل ہے بلکہ ہر قسم کے فسادات کا مرکز ہے۔ جبکہ پچھلے دنوں بلوچستان تربت میں فسادات ہوئے۔ صوبہ پنجاب کے کیا کہنے، بڑا صوبہ ہونے کی وجہ سے یہاں بڑے بڑے فسادات ہوتے ہیں۔ یہاں کوئی شہر کوئی محلہ محفوظ نہیں۔ یونیورسٹی میں طلبا کا قتل ہو یا مساجد میں بموں کی ہلاکت خیزی یہ سب فرقہ واریت کی دین ہے۔

فرقہ واریت نے باہمی رواداری، اخوت، انسانیت، ہمدردی، قانون اور دین کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ یہاں کا بچہ بچہ اس ظلم اور بربریت کے خلاف چیخ رہا ہے۔ اخبارات کے اداریئے دیکھئے تو فرقہ واریت کے خلاف، دانشوروں کے کالم دیکھئے تو فرقہ واریت کے خلاف۔ صرف علمائے دین خاموش ہیں، کچھ نہیں کہتے کیونکہ یہ ان ہی کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔

پچھلے دنوں وزیرِاعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کو بھی کہنا پڑا کہ فرقہ واریت تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔ لہٰذا قیامِ پاکستان کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اس پر قابو پانا ضروری ہے ــــ بلاشبہ یہ الفاظ ایک دردمند دل کی عکاسی کرتے ہیں۔ فرقہ بندی یقیناً ختم ہونی چاہیئے مگر کیسے؟ جسے حکومت زندہ و پائندہ رکھنا چاہے۔ طاقت کے انجکشن لگاتے۔ اسے فقط عوام کیسے ختم کر سکتے ہیں۔

دستورِ پاکستان کی شق (آرٹیکل) (۱) ۲۲۷ میں کہا گیا ہے۔ تمام موجودہ قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق وضع کیا جائے گا جو قرآن و سنت میں مذکور ہیں اور کوئی ایسا قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو ان احکام کے خلاف ہو۔ پھر ہوا یہ کہ مارشل لا کے دور میں صدارتی حکم ۱۴/۱۹۸۰ء مجریہ ستمبر ۱۹۸۰ء کے تحت آرٹیکل مذکورہ یعنی ۲۲۷ کی وضاحت کے ذریعے اس میں دیے گئے اصول کی نہ صرف نفی کر دی بلکہ مسلمانوں کے مسلمہ فرقوں کو آئینی

تحفظ فراہم کر کے دین میں فرقہ سازی کے بارے میں واضح احکام کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ انگریزی میں یہ وضاحت یوں ہے:

(EXPLANATION :- IN THE APPLICATION OF THIS CLAUSE TO THE PERSONAL LAW OF ANY MUSLIM SECT, THE EXPRESSION QURAN AND SUNNAH " SHALL MEAN THE QURAN AND SUNNAH AS INTERPRETED BY THAT SECT.).

غور فرمایا آپ نے آرٹیکل ۲۲۷ میں ایک طرف تو یہ کہا گیا ہے کہ ملک کے تمام موجودہ قوانین قرآن وسنت کے مطابق ڈھالے جائیں گے اور آیندہ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جائے گا جو قرآن وسنت کے خلاف ہو اور دوسری طرف اسی آرٹیکل ۲۲۷ کے وضاحتی نوٹ (EXPLANATION) میں اس اصول کی یہ کہہ کر خود ہی نفی کر دی کہ مسلمانوں کا ہر مذہبی فرقہ شخصی قانون (PERSONAL LAW) کی حد تک "قرآن وسنت" کی اصطلاح کی تشریح وتعبیر اپنے اپنے فرقے کی فقط روایات کے مطابق کر سکتا ہے۔ گویا اسلام کے نام پر حاصل کئے جانے والے ملک کے اسلامی دستور میں مذہبی فرقوں کے وجود کو نہ صرف آئینی تحفظ دے دیا گیا ہے۔ بلکہ ایک ہی مملکت میں رہتے ہوئے ہر مذہبی فرقہ کو شخصی قوانین کی حد تک ہی سہی الگ الگ ضوابط قوانین پر چلنے کی اجازت بھی دے دی گئی ہے اور اس طرح اللہ کے دین کی وحدت کو شخصی اور پبلک لاز میں تقسیم کر کے فرقہ پرستی کے بارے میں قرآنِ حکیم کے واضح احکام کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی گئیں (۳۰/۳۲-۳۱)

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

ذرا رُکئے اور سوچئے

اسلامی دستور اور اس میں مذہبی فرقوں کا آئینی تحفظ۔ یا للعجب! ایک طرف تو فرقہ واریت کے ناگ کو دودھ پلایا جا رہا ہے۔ دوسری طرف اس کی تباہ کاریوں پر واویلا کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو اس امتِ واحدہ کو صاف لفظوں میں کہہ دیا وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۳) تم سب مل کر اس ضابطۂ خداوندی کو محکم طور پر تھامے رہو اور فرقوں میں مت بٹ جاؤ۔ حبل اللہ ایک ہے ایک سے زیادہ نہیں۔ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ..... (۴۲/۱۳) تم سب اسی دین کو قائم

کرو اور اس میں کسی قسم کا تفرقہ نہ پیدا کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی وضاحت سے مسلمانوں سے کہہ دیا کہ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ ..... (۳/۱۰۴) دیکھنا تم بھی کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کی طرف سے واضح حقائق مل جانے کے بعد فرقے بنا لئے اور آپس میں اختلاف کرنے لگ گئے وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۳/۱۰۴) یہ لوگ جو فرقوں میں بٹ جاتے ہیں اور آپس میں اختلاف کرنے لگ جاتے ہیں ان پر سخت عذاب مسلط کر دیا جاتا ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ فرقہ بندی عذاب کی زندگی ہے اور ہم اسی عذاب میں گرفتار ہیں۔ اختلاف اور فرقہ بندی کی زندگی لعنت اور عذاب کی زندگی ہے۔ خدا کی رحمت تو ان پر ہوتی ہے جو امتِ واحدہ بن کر رہتے ہیں اور اختلافات سے بچتے ہیں۔ قرآن نے تو اس سے بھی آگے بڑھ کر کہہ دیا کہ

وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا ؕ (۳۰/۳۲-۳۱)

یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور فرقے بن گئے ـــــ اس فرقہ بندی میں ہوتا یہ ہے کہ ہر فرقہ اس خیال میں مگن رہتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور باقی فرقے باطل پر ہیں۔ فرقہ پرستی کی یہ نفسیات میں جن کا مشاہدہ ہم ہر روز ہر جگہ کرتے ہیں۔ بہرحال قرآن نے امتِ واحدہ سے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر تم نے دین میں فرقے پیدا کر لئے تو یہ توحید نہیں شرک ہو گا اور کوئی فرقہ یہ کہہ کر اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکے گا کہ ہم اصلی اور حقیقی اسلام پر قائم ہیں اور دوسرے فرقے باطل پر ہیں۔ اسی بنا پر رسول اللہ سے کہہ دیا گیا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ ..... (۶/۱۶۰) جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور ایک فرقہ بن کر بیٹھ جائیں اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں (کیونکہ وہ توحید پرست نہیں رہتے مشرک ہو جاتے ہیں)۔

دین ایک راستے پر چلنے کا نام ہے مختلف راستوں پر چلنے کا نہیں۔ لیکن ہمارے مذہبی پیشوا اپنی عافیت امت کی تفریق میں سمجھتے ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ اگر اللہ کا دین رائج ہو گیا تو ان کی اجارہ داریاں ختم ہو جائیں گی۔ ان سے فرقہ پرستی کے خاتمہ کی توقع عبث ہے۔ یہی تو ہیں جو قرآن کے الفاظ میں اللہ کے راستے میں رکاوٹ بنے ہیں (۹/۳۴)۔

حکومت کو چاہیئے کہ دورنگی چھوڑ دے، فرقہ پرستی کو قانونی تحفظ نہ دے۔ قوانین کا اطلاق ہر ایک پر یکساں ہو، پرسنل لاز کا وجود ختم کر دے کیونکہ یہ سیکولر سٹیٹ کی پہچان ہے۔

امن کیسے قائم ہو

دیگر ممالک میں پولیس امن عامہ (PUBLIC SECURITY) کے کام آتی ہے۔ یعنی جو بدامنی کرے یہ اسے گرفت میں لے کر سزا دلواتی ہے۔ لہٰذا ان کی وجہ سے معاشرے میں امن و امان رہتا ہے۔ مگر اپنے وطن میں اس کا الٹ ہے۔ پاکستان کی عوام ڈاکوؤں، چوروں اور لٹیروں سے اتنی تنگ نہیں، جتنی پولیس سے تنگ ہے۔ پولیس مکمل طور پر اپنا وقار کھو چکی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں بھی باکردار پولیس والے ہوں مگر بدکردار وہ کچھ کر رہے ہیں کہ پولیس اور کردار دو الگ چیزیں نظر آ رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مرحوم جونیجو نے کہا تھا کہ میں کالی بھیڑوں سے پولیس کو صاف کر دوں گا تو عوام یہی سمجھے کہ پولیس کا محکمہ ختم کیا جا رہا ہے۔ ۲۴ جولائی روزنامہ جنگ کے اداریے کے مطابق گنڈا سنگھ والا کے نواحی گاؤں برج کلاں کے ایک شخص کی تین بیٹیوں کو تھانے کے اندر تین پولیس اہل کاروں نے بے آبرو کر دیا۔ ساری رات ان کے ساتھ زیادتی کرتے رہے۔ اسی دن کے اخبار میں یہ خبر بھی فرنٹ پیج پر لگی تھی کہ تین عورتوں کو بیس تیس چھتر ڈنڈے الگ مارے گئے۔ دوسرے لوگوں کی موجودگی میں پولیس والے کہتے رہے کہ چوری مان لو ورنہ کپڑے اتار کر بے پردہ کر دیں گے۔ بقول اخبار کے پانچ ہزار روپیہ رشوت لے کر جان چھوڑی ــــ ایک خاتون پر اتنا تشدد کیا کہ وہ پانچ روز کے بعد بھی نہیں بیٹھ سکتی۔ چھ ماہ کی حاملہ خاتون کو الٹا لٹا کر تشدد کرتے رہے۔ اس کی چیخیں تھانے میں گونجتی رہیں۔ لیکن کسی نے مدد نہ کی۔

اگر دیکھا جائے تو ڈاکوؤں، چوروں، لٹیروں اور تخریب کاروں سے پولیس والوں کا گراف اونچا ہی رہتا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ ڈاکوؤں سے مقابلہ سخت ہوتا ہے۔ جان کا خطرہ الگ رہتا ہے۔ مگر اس کا بدلہ بنتے عوام سے تو نہیں لینا چاہیئے۔ عوام دوہری مصیبت میں گرفتار ہیں۔ ایک طرف ڈاکو لٹیرے تخریب کار اور دوسری طرف پولیس اور فرقہ واریت کا دیو استبداد بھی آزاد پھر رہا ہے۔ عوام کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ کئی دانشور کہہ چکے ہیں کہ خانہ جنگی کا امکان ہے۔ ایسے موقعہ پر پولیس کو دانشمندی کا ثبوت دینا چاہیئے۔ کراچی نارتھ ناظم آباد کے واقعے سے عبرت لینی چاہیئے جہاں فرض شناس ایس ایچ او بہادر اور چھ سپاہیوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ ایک منٹ میں ہزار راؤنڈ چلائے گئے کسی کی آنکھ سے ان کے لئے ایک آنسو نہ ٹپکا۔ کیوں؟ اس لئے کہ پولیس کے خلاف ہر سینے میں نفرت کا لاوا ابل رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ حالات مزید خراب ہوں، افسرانِ بالا کو اپنے عملے کے کردار اور کارکردگی پر ایک نظر ڈالنی چاہیئے۔ انہیں تنخواہ اس بات کی تو نہیں دی جاتی کہ یہ معاشرے کا چین و سکون لوٹ لیں اور بے گناہوں کی عزتوں سے کھیلیں۔ عوام کے جان و مال سے تخریب کار اور ڈاکو کھیل رہے ہیں۔ پولیس تماشائی یا ایمپائر بن کر کھیل دیکھے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ہماری جو خیلی پولیس خود میدان میں آ کر کھیلنے لگتی ہے۔ ایسی حالت میں امن قائم ہو تو کیونکر۔ انصاف کہاں سے ملے۔

(حکیم محمد مسیح الدین صدیقی (بھارت)

قرآن اور مسلمان

مسلمانوں کی فلاکت اور بدبختی کی کہانی سالہاسال پرانی ہے جو کسی مفکر نے چند لفظوں میں بیان کر دی۔ کہتا ہے جب سے مسلمانوں کو قرآن کا "بدل" ملا ہے یہ ذلت و مسکنت میں مبتلا ہیں۔ (بدل یعنی فقہ اور روایات وغیرہ)۔

اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا تھا۔ اے لوگو! میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں جس پر قائم رہے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے اور وہ ہے اللہ کی کتاب (خطبۂ وداع) اور یہی قرآنِ حکیم کا دعوٰے ہے۔ اِنَّ ھُوَ اِلَّا ذِکرٌ للعالمین (۱۲/۱۰۴) یہ سارے عالم کی رہنمائی کرنے والی کتاب ہے۔

تیسری صدی میں روایات کے انبار لگے اور اختلافات شروع ہو گئے۔ مسلمان کہنے لگے رسول اللہ نے دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ پہلی کتاب اور دوسری اپنی سنت (وحیٔ غیر متلو)۔ روافض نے کہا نہیں وہ کتاب کے ساتھ اپنے اہلِ بیت (بارہ امام) بھی ہم کو دے گئے ہیں۔ یہ حدیثِ ثقلین ہم کو اماموں سے ملی ہے۔ تفصیل شیعوں نے بتلایا کہ رسول تین چیزیں چھوڑ گئے ہیں۔ اللہ کی کتاب، اپنی سنت اور اپنے اہلِ بیت (پنج تن پاک)۔ چنانچہ یہ اہلِ سنت مشہور ہوئے۔ یعنی سنت کے پرستار۔ پھر کسی نے نہ سوچا کہ وہ قوم جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہدایت کے لئے فخریہ چنا تھا۔ کنتم خیر امۃٍ اخرجت للناس۔ وہ اتنے بہت سے فرقوں میں کیوں بٹ گئی اور زوالِ بغداد، زوالِ اندلس، بغاوتِ ہند، جنگِ بلقان اور تقسیم ہند کے ابتلا میں کیوں ڈالی گئی یعنی معتوب و مقہور کیوں ہو گئی۔

اس قوم سے تو اللہ کا وعدہ تھا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ۔ تم غالب رہو گے اگر صاحبِ ایمان رہے۔ بلکہ فرمایا تھا وَ مَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ ھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا یَخٰفُ ظُلْمًا وَّ لَا ھَضْمًا (۲۰/۱۱۲) یعنی تم میں سے ہر فرد جو نیک کام کرے گا اور مومن (صاحبِ ایمان) ہو گا اس کو نہ ظلم کا خوف ہو گا اور نہ نقصان کا۔

چنانچہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان خود اپنا محاسبہ کریں اور فیصلہ کریں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے پورے نہ کئے یا خود مسلمان ہی اس کی شرائط پر پورے نہ اترے اور الٹا شکوہ کرتے رہے ۔ برق گرتی ہے

تو بے چارے مسلمانوں پر۔ مگر کیا یہ مسلمان کہلانے کے مستحق ہیں۔ کیا یہ اللہ کی نظروں سے گرے ہوئے بندے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں تنبیہہ کر دی تھی کہ اگر تم نے قرآن کو چھوڑا تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ پھر ہم کوئی دوسری قوم لے آئیں گے جو اللہ سے محبت کرے گی اور اللہ ان سے محبت کرے گا۔ کیونکہ اللہ کے لئے سنّت پرست، پنجتن پرست، رام پرست، کرشن پرست، بجرنگ بلی اور یا علی والے سب برابر ہیں۔ چنانچہ ساتویں صدی میں چینی ترکستان سے تاتاریوں کا ایک غول مسلمانوں کی تادیب کے لئے بھیجا جس نے سولہ لاکھ بدعقیدہ اور گمراہ مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ان کی جمع کی ہوئی سنّت و اہل سنّت کی تمام علمی متاع دریا بُرد کر دی۔

مزید چھ سو سال بعد مسلمانوں کو علم و حکمت سکھانے کے لئے یورپ کے برفانی علاقوں سے نصاریٰ کو اٹھایا اور وہ ساری اسلامی دنیا پر مسلط ہو گئے تھے۔ اسلامی حکومتیں ختم کر دی گئیں جو عیاشی اور بدمعاشی کے اڈے تھے اور مسلمانوں کو اُن کا غلام بنا دیا۔ پھر ہم نے دیکھا کہ نصاریٰ پر نعمتوں اور برکتوں کی بارش ہونے لگی نہ صرف ایشیا اور افریقہ پر ان کا قبضہ ہو گیا بلکہ دو نئی دنیائیں (امریکہ اور آسٹریلیا) ان کو بخش دی گئیں اور آج بھی وہ چاند اور ستاروں پر کمندیں پھینک رہے ہیں اور مسلمان ابھی یہ طے نہ کر پائے کہ علی کی سنّت اپنائیں یا شیخین کی، چنانچہ ان پر مسلسل قہر و عذاب کا کوڑہ چل رہا ہے اور چھانٹی ہو رہی ہے۔ تقسیم ہند کے نتیجہ میں دس لاکھ مسلمان پنجاب میں مارے گئے۔ پانچ لاکھ ریاست حیدر آباد میں، پاک و ہند جنگوں میں کتنے مرے معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ بنگلہ دیش کے قیام میں سنا ہے کہ چالیس پچاس لاکھ بنگالی اور اُردو بولنے والے آپس میں لڑ مرے، اوپر سے قدرتی آفات ہیں۔ ہر سال سیلاب یا زلزلہ آتا ہے۔ حادثات و امراض قلب و سرطان میں ہزاروں مر جاتے ہیں۔ کیا اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ یہی سلوک ہو سکتا ہے جبکہ قرآنِ حکیم کا وعدہ ہے کہ

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا وَ الصَّابِئُوْنَ وَ النَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (۵/۶۹)

۱۔ یعنی اہلِ ایمان۔ خواہ مسلمان ہوں یا یہودی یا ستارہ پرست (برہمن) یا عیسائی۔

۲۔ جو بھی اللہ پر ایمان رکھے گا، یوم حساب سے ڈرے گا اور اچھے کام کرے گا تو وہ زندگی میں نہ خوف زدہ رہے گا نہ مغموم۔

مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی طرح غلط فہمی ہے کہ یہ اللہ کے منتخب بندے ہیں، ان کے رسول اللہ شافع مذنبین یعنی فاسقوں فاجروں کو بخشوانے والے ہیں جب کہ قرآن کا فیصلہ ہے لھا ما کسبت جو کریگا بھریگا۔

قرآنِ حکیم میں امتِ محمدیہ کے مستقبل کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔ البتہ امتِ عیسٰی کے بارے میں واضح وعدہ موجود ہے۔

وَ جَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ
(۳/۵۵)

تیرے ماننے والوں کو قیامت تک، کافروں پر مسلط رکھوں گا۔

اس سے مسلمانوں اور ان۔ کے اسلام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے مسلمان اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ہوتے تو نصاریٰ کی غلامی میں نہ جاتے اور ان کے پاس صحیح اسلام ہوتا تو یہ اقوامِ عالم کے سامنے پیش کرتے اور ملحدوں کو قائل کرتے مگر یہ نصاریٰ کی جوتیاں سیدھی کرنے میں مگن ہیں۔

قرآن نے مشرکوں کو اپنی بدترین مخلوق بتایا ہے' ان کی پہچان ہے۔

او لا یرون انھم یفتنون فی کل عام مرۃً اور مرتین ثم لا یتوبون و لا ھم یذکرون

دیکھتے نہیں ہو کہ مشرک ہر سال ایک یا دو بار فتنوں (مصیبتوں) میں ڈالے جاتے ہیں۔ پھر بھی نہ توبہ کرتے ہیں نہ نصیحت مانتے ہیں (بیماریاں' حادثات' فرقہ واری فسادات)

چاہیئے تو یہ تھا کہ مسلمان اپنے حال پر غور کرتے اور اپنا معیارِ اسلام قرآن سے معلوم کرتے مگر یہ ملفوظات و منقولات ہی پڑھتے ہیں اور اسی میں بھٹک رہے ہیں اور قدرت و اقوامِ غیر کے جوتے کھا رہے ہیں۔

ضرورتِ رشتہ

خوش قامت دوشیزہ عمر 30 سال (اس سال ایم کا امتحان دیا) مقامی گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول میں ٹیچر کے لئے رشتہ درکار ہے۔

خط و کتابت کیلئے

ز۔ع بمعرفت 25 بی، گلبرگ 2۔ لاہور

ذکر اُن کا جنھوں نے

ہمارے کَل کے لئے اپنی جانیں قربان کردیں

قارئین کرام! یہ مہینہ ستمبر کا ہے. آج سے ۲۹ برس پہلے اسی ماہ کی ۶ تاریخ کو مکّار دشمن ہندوستان نے ہماری سرحدوں پر حملہ کیا تھا. ہمارے اکثر علماء تو مسجدوں میں بیٹھ کر جہاد کی فضیلت بیان کرتے ہیں. جنگ بندی کے بعد بھی کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ محاذ پر جائے. علامہ پرویزؒ صاحب خود محاذ پر گئے تھے. مندرجہ ذیل تحریر میں وہ اپنا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں. ادارہ

پاکستان کی نئی "زیارت گاہیں"

علامہ پرویزؒ

سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملّتِ ما سازگار آمد

۲ اکتوبر ۱۹۶۵ء کی شام، جبکہ سورج کی خونِ شفق میں ڈوبی ہوئی کرنیں، واہگہ کے لالہ زار کو الوداعی سلام کہہ کر رخصت ہو رہی تھیں، میں، چند احباب کی معیت میں باٹا پور فیکٹری سے باہر نہر کے کنارے کھڑا تھا. سامنے، نہر کے پل کی شکستہ سلیں پانی میں سرنگوں تھیں اور پانی این و آں سے بے پرواہ، نہایت خاموشی سے آگے بڑھا جا رہا تھا. اسے اس کا بھی علم و احساس نہیں تھا کہ وہ کس طرح پاکستان کی تاریخ کے ایک نئے باب کا عنوان بن چکا ہے ــــ اشیائے فطرت کی کیفیت ہی یہ ہے کہ وہ اکثر اوقات انسانی تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیتی ہیں لیکن اس کا (CREDIT) خود نہیں لیتیں. ان کے برعکس، یہ حضرتِ انسان ہے جس کی حالت یہ ہے کہ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (۳/۱۸۷) یہ ان لوگوں کے لئے بھی اپنی تعریف چاہتا ہے جنہیں اس نے سرانجام نہیں دیا ہوتا ــــ میں اس نہر کے کنارے خاموش کھڑا تھا اور میرے پردۂ تصور پر ماضی کے نقوش ایک رنگین فلم کی طرح اُبھرتے چلے آرہے تھے ــــ اکثر ایسا ہوا کہ اتوار کے دن، درس کے بعد ہم نہر

باری دوآب کے کنارے کنارے، سیدھے واہگہ کی سرحد تک چلے گئے۔ راستہ میں یہ بڑی نہر (لنک کینال) بھی پڑتی تھی۔ اُس وقت یہ بات کبھی حیطۂ تصور میں بھی نہیں آئی تھی کہ یہ نہر جسے ہم محض حسنِ مناظر کی جولان گاہ سمجھ رہے ہیں، ایک دن پاکستان کا باب السلام۔ ہماری ہر متاعِ حیات کی محافظ و پاسبان۔ سرزمینِ لاہور کے لئے حصن حصین اور جسدِ ملت کی رگِ حیات بن جائے گی۔ پھر میرے سامنے ۱۴ اگست کی دوپہر کا وہ منظر بھی تھا جب واہگہ سرحد پر رن اوف کچھ کے ہنگامہ کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے قیدیوں کے تبادلہ کی ایک غیر رسمی لیکن نہایت مؤثر اور عبرت آگیں تقریب منعقد ہوئی تھی۔ اور جب ہمارے ایک قیدی کے بدلہ میں، ہماری طرف سے ہندوستان کے سات قیدی چھوڑے جاتے تھے تو اس وقت ہمارے دلوں میں پاکستان کی عظمت و برتری کا احساس کس قدر گرم جوشی پیدا کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری نگاہوں کے سامنے کسٹم کالونی کی حسین اور مصفا عمارت تھی جہاں مشروبات سے ہماری نہایت بے تکلفانہ تواضع ہوئی تھی۔ پھر میرے سامنے وہ منظر آیا جب، ۶ ستمبر سے ایک ہی ہفتہ پہلے، ہم ستلج رینجرز کے کمانڈر میجر علیم کی دعوت پر شام کے وقت جھنڈے اتارنے کی خاموش اور پُروقار تقریب دیکھنے کے لئے سرحد کے پھاٹک تک گئے تھے ــــ خلوص اور محبت کا پیکر میجر علیم ایک باغ و بہار شخصیت! واپسی پر رات ہوگئی تو جلو موڑ کی دورویہ دکانیں، جہاں پہلے آبادی کا نام و نشان تک نہیں تھا، جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔

یہ سب کچھ میری نگاہوں کو دامانِ باغبان و کفِ گل فروش بنا رہا تھا کہ یکایک اس فلم کا دوسرا سین سامنے آگیا۔ نہر کے اس پار، جلو موڑ کی ساری آبادی ویرانے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ تا حدِ نگاہ ہولناک خاموشی اور قبرستان کا سا سکوت تھا۔ انسان تو ایک طرف، کوئی چرند پرند بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ حسین و شاداب کسٹم کالونی ویران ہو چکی تھی۔

نہر سے اِس طرف چند قدموں تک، لیکن اس پار، دور دور تک کھنڈرات ہی کھنڈرات دکھائی دے رہے تھے ــــ میجر علیم اور ان کے ساتھیوں کے متعلق مختلف قیاسات تھے۔ انہوں نے جس جانبازانہ ہمت اور مجاہدانہ شجاعت سے، بھارتی فوج کے اچانک شبخوں کو تہ و بالا کر دیا تھا، اس کے متعلق پختہ خبریں وجہِ نشاطِ روح ہو رہی تھیں۔

لیکن اس کے بعد ان پر کیا گزری، اس کے متعلق کوئی بھی یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ گمانِ غالب یہی ہے کہ وہ حیاتِ جاوداں کی ہزار عشرت سامانیاں اپنے جلو میں لئے فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ ۝ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝ (۵۴/۵۵)۔ شاد کام و کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں ــــ وہ جہاں بھی ہیں، خدائے ذوالمنن کے سحابِ کرم کی لاانتہا بارشیں ان پر گہرباری کریں۔

میں اپنی خیالات میں مستغرق تھا کہ کھٹ کھٹ کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا تو ہمارے مورچوں کے قریب ایک جوانِ رعنا، میجر کی پرشکوہ وردی میں ملبوس، کڑی کمان کے تیر کی طرح آگے بڑھتا چلا آرہا ہے۔ چہرہ نہایت شگفتہ و شاداب، ایسے افسردہ و پژمردہ ماحول میں یوں دکھائی دیتا تھا جیسے صحرا میں لالہ کا پھول کھلا ہو۔ پاس سے گزرا تو ہمارے ساتھ کھڑے میجر کو دوستانہ سلام کرتا آگے بڑھ گیا۔ لیکن چند قدم جانے کے بعد لوٹا اور آکر ہم سب سے نہایت محبت اور خلوص سے ملا۔ کہا کہ معاف فرمائیے! سامنے جھاڑی کی ایک جنبش نے میری توجہ کو اس قدر جذب کر رکھا تھا کہ میں رُک نہ سکا۔ اب اطمینان کے بعد واپس آیا ہوں۔ باتیں تو چند ہی کیں لیکن انہی سے اس کا حسنِ سیرت اور بلندیٔ کردار آئینے کی طرح سامنے آگیا۔ اقبالؒ کے تصور کا ایک جیتا جاگتا مرقع کہ

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا — شباب جس کا ہے بے داغ ضربِ کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر — اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

اتنے میں مجھے نہر کے اس پار کچھ حرکت سی محسوس ہوئی۔ یہ تین سکھ سپاہی تھے جو ریت کی خود ساختہ دیوار کے پیچھے بھارت کے ترنگے جھنڈے کو سنبھالے کھڑے تھے۔ میں نے میجر صاحب سے پوچھا کہ یہ اتنے قریب ہیں کبھی کوئی بدتمیزی تو نہیں کرتے۔ میں نے دیکھا کہ یہ سنکر اس جیالے سپاہی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ کہنے لگا۔ پرویز صاحب! آپ بدتمیزی کہتے ہیں؟ اگر یہ کبھی ہماری طرف میلی نگاہ سے بھی دیکھیں تو خدا کی قسم یہیں کھڑے کھڑے ان کی آنکھیں پھوڑ دوں۔ آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ یہ مفتوحہ علاقہ پر اپنا جھنڈا گاڑے کھڑے ہیں۔ اس احساس سے سپاہی کا سر آسمان کو چھو جانا چاہیئے۔ لیکن آپ نے دیکھا ہے کہ وہ کس قدر افسردہ و پژمردہ کھڑے ہیں۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ ان کی حالت ایسی ہے جیسے کسی نے شیر کے سامنے بکری باندھ رکھی ہو۔ انہیں معلوم ہے کہ یہ محض فائر بندی کی ڈھال ہے جس کے پیچھے انہیں سانس لینے کی مہلت مل گئی ہے۔ ورنہ زندگی ان کے نصیب میں کہاں؟ — وہ یہ کہہ رہے تھے اور مجھے خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کہیں ابھی بندوق کی لبلبی نہ دبا دیں۔

اتنے میں میرے احباب نے کہا کہ اب ہمیں واپس چلنا چاہیئے۔ ہم نے رخصت چاہی تو اس ایریا کے کمانڈر نے کہا کہ نہیں صاحب! آپ چائے کا پیالہ پیئے بغیر کیسے واپس جا سکتے ہیں۔ ہم نے ہزار معذرت چاہی لیکن سپاہی کے آگے کس کی پیش جا سکتی ہے؟ باٹا کمپنی کے اندر ان کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ وہ وہاں زبردستی لے گئے دروازے کے باہر ایک مگرمچھ نما بم پڑا تھا۔ کہنے لگے اس سے ذرا ہٹ کر آیئے گا۔ یہ دشمن کا "ان پھٹا" بم ہے۔ میں نے اسے دیکھا تو بے ساختہ زبان پر آگیا کہ

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

انہوں نے اس ویرانے میں، ایسی بے سروسامانی کے عالم میں، بڑی محبت سے چائے پلائی۔ چائے کے دوران گفتگو میں نہر کے پل کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگے کہ اس کی داستان بڑی لرزہ انگیز اور ساتھ ہی حوصلہ افزا ہے۔ ۶ ستمبر کو صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب، دشمن اس پل کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس کے پیچھے امرتسر تک، سپاہ کا ایک سیلابِ بلا انگیز ٹھاٹھیں مارتا آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ بکتر بند گاڑیوں اور ٹینکوں کا ایک بے پناہ سلسلہ ان کے جلو میں تھا۔ ان کے اور پاکستان کے درمیان یہی ایک پُل تھا۔ عام لوگوں کو یہی معلوم ہے کہ ہم نے اس پل کو فوراً توڑ ڈالا اور یوں لاہور محفوظ ہو گیا۔ لیکن آپ یہ سُن کر حیران ہونگے کہ یہ پل شام کے ساڑھے چار بجے تک نہیں ٹوٹا تھا، ایک مرتبہ کوشش کی تو اس میں صرف دراڑیں پڑیں۔ آپ سوچیئے کہ وقت کس قدر نازک تھا۔ اس ذرا سے ٹکڑے پر مسلسل دس گھنٹے تک گھمسان کی لڑائی جاری رہی۔ ہمارے دلوں میں یہ احساس قیامت برپا کر رہا تھا کہ اگر ایک دفعہ دشمن نے اس پل کو عبور کر لیا تو پھر اس کا مسمار کرنا شاید ناممکن ہو جائے اور اس کے بعد جو کچھ لاہور پر گزر سکتی تھی اس کے تصور سے بھی آج روح کانپتی ہے۔ اس احساس نے پل کے اِس طرف جانبازوں کی ایک آہنی دیوار کھڑی کر دی اور اس دیوار نے دشمن کے سیلابِ بے پناہ کے روکنے میں جو کچھ کر دیا اس کی مثال شاید ہی تاریخ کے اوراق پیش کر سکیں۔ مسلسل دس گھنٹے تک یہ صبر آزما کشمکش جاری رہی۔ تا آنکہ، ہمارے قابلِ صد افتخار جانباز سپاہی، میجر آفتاب[1] نے، واقعی ہتھیلی پر سر رکھ کر، اسے توڑ ڈالا۔ فوج نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور دشمن خاسر و نامراد مُنہ تکتا رہ گیا۔ یہ ہے وہ پل جس کی ٹوٹی ہوئی سلوں پر، اِن سرفروشوں کی داستانِ عظمت، انمٹ حروف میں نقش ہو چکی ہے۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (۲/۱۵۷)۔

ہم باہر نکلے تو معلوم کیوں، ترنگے جھنڈے پر میری نگاہ بلا شعور جا پڑی ــــ پاکستان کی سرزمین پر بھارت کا جھنڈا!ــــ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت ــــ میری آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ کمانڈر نے دیکھا تو میرے مونڈھے پر ہاتھ رکھ کہا کہ مت گھبرایئے۔ چند دنوں تک اسے برداشت کر لیجئے۔ جس دن فائر بندی کا حکم واپس لیا گیا اس دن آیئے گا اور پھر دیکھئے گا کہ اس جھنڈے کی دھجیاں کس طرح فضا میں اڑ رہی ہیں ــــ

---

[1] میجر آفتاب، ہمارے ایک مرحوم دوست کے قابلِ فخر خلف الرشید ہیں۔ اور اب تو پوری ملت کے لئے باعثِ صد افتخار ہیں ویسے بھی وہ گلبرگ میں ہمارے قرب میں رہتے ہیں، اللہ انہیں ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھے۔

اور اتنے میں، میں مشورہ دوں گا کہ آپ کھیم کرن ہو آئیے۔ تاکہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی آپ کے سامنے آجائے۔

کھیم کرن

چنانچہ ۲۱ اکتوبر کی شام ہم کھیم کرن کے محاذ کی طرف گئے۔ قصور سے جب شاہراہ چھوڑ کر، ہم کھیم کرن کی طرف مڑے ہیں تو سب سے پہلے پھر اسی نہر کو سلامی دی جسے میں نے ابھی ابھی پاسبان پاکستان اور باب السّلام کہہ کر پکارا ہے۔ نہر کو پار کیا تو سامنے ایک وسیع و عریض میدان تھا جس میں بھارت کے شکستہ ٹینک یوں بکھرے پڑے تھے جیسے ڈھور ڈنگروں کے ہڈیوں کے ڈھانچے ہوں۔ اس سے یہ نظر آیا کہ دشمن ایک وقت میں یہاں تک بڑھ آیا تھا۔ تھوڑی دُور آگے گئے تو پاکستان کی سرحد ختم ہو گئی اور اب ہمارے قدم اس سرزمین پر تھے جسے ہم نے بھارت سے فتح کر کے حاصل کیا ہے۔

اس مقام پر یک لخت، اٹھارہ سال پہلے کا ایک ایسا واقعہ ابھر کر شعور کی سطح پر آگیا جو اس سے پہلے کبھی یاد نہیں آیا تھا۔ تقسیم ہند کے وقت، جب میرا دہلی سے روانہ ہونے کا وقت آیا، تو دفتر کے ہم عصر ہندوؤں نے مجھے الوداعی پارٹی دی تھی ـــــ یہ قوم بھی عجیب و غریب واقع ہوئی ہے۔ یہ مجھے پس پشت "اورنگا" (اورنگ زیب کا سکھا شاہی حقارت آمیز تلفظ) کہہ کر پکارا کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی پارٹیاں بھی دیا کرتے تھے۔ اور پھر پارٹی بھی ہندوستان کو چھوڑتے وقت۔ یا للعجب! پارٹی کے بعد جب رخصت ہونے لگے تو ان میں سے ایک بے تکلف ہمکار نے کہا کہ "چوہدری صاحب! پھر دہلی کب آؤ گے"۔ میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔ "جب دہلی فتح کر لیں گے"۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں نے اس اٹھارہ برس میں سرزمینِ ہند پر قدم تک نہیں رکھا اور آج پہلی دفعہ ہندوستان کی سرزمین کے اس رقبے پر قدم رکھا جسے ہم نے فتح کیا ہے۔ یہ واقعہ یاد آیا اور یوں محسوس ہوا جیسے پاؤں کے تلوے سے ایک لہر اٹھی ہے اور برقِ تپاں بن کر رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی ہے۔ جذبۂ تشکر سے میرا سر نیاز بدرگاہِ ربُّ العزت جھک گیا۔

اب راستے میں رکنے کو جی نہیں چاہتا تھا اس لئے تیزی سے آگے بڑھے۔ تھوڑی دیر میں ہم کھیم کرن کے سامنے تھے۔ ہمارے سامنے کھیم کرن نہیں تھا، عبرت و موعظت کی ہزار داستانوں کا مرقع تھا۔ ایک ایسی بستی جو ابھی چند دن پہلے پندرہ بیس ہزار نفوس کا جیتا جاگتا مسکن تھی، اب کھنڈرات کے سوا کچھ نہ تھی۔ اس کا کوئی مکان ایسا نہیں تھا جس پر چھت موجود ہو۔ کوئی دیوار ایسی نہیں جو صحیح و سالم کھڑی ہو۔ کوئی دروازہ ایسا نہ تھا جو جل کر کوئلہ نہ ہو گیا ہو۔ وہاں وحشت ہی نہیں دہشت کا کیا عالم تھا آپ اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ ساری بستی میں کوئی ایک سانس لینے والا بھی نہیں تھا۔ بڑا ہی ڈراؤنا منظر تھا۔ اکثر مکانات پر اُنے

زمانے کی چھوٹی اینٹوں کے قلعہ نما محل تھے جس سے مترشح ہوتا تھا کہ یہ قصبہ قدیم زمانے سے آباد چلا آرہا تھا۔ لیکن اب اس کے کھنڈرات کی ایک ایک اینٹ پر یہ منقوش تھا کہ

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ ۝ (۲۲/۴۵)

کتنی ہی بستیاں تھیں جنہیں ہم نے تباہ کر دیا کیونکہ وہاں کے رہنے والے ظالم تھے۔ ان میں اب کوئی بھی نہیں بستا۔ وہ اس طرح اُجڑی ہوئی ویران پڑی ہیں کہ ان کے کنوئیں بے کار ہو چکے ہیں۔ ان کے بڑے بڑے مستحکم قلعے اور محلات کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

اس لئے فاعتبروا یا اولوالالباب۔

کھیم کرن سے دو تین میل اور آگے بڑھے تو اس مقام تک پہنچ کر رُک گئے جہاں سے آگے جانا خطرہ سے خالی نہیں سمجھا جاتا کیوں کہ تھوڑی دور آگے ہندوؤں کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ وہاں سے ہماری سرحد سامنے نظر آرہی تھی۔ اِدھر ہمارے سپاہی ان کے سامنے دو گز کے فاصلے پر دشمن کی فوج کا دستہ۔ درمیان میں کوئی حفاظتی دیوار نہیں!

اس مقام پر ایک نوجوان کماندار تھا ــــ غالباً صوبیدار ــــ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ کہنے لگا کہ وہ ۶ ستمبر کی صبح اس محاذ پر آگیا تھا۔ ساری جنگ لڑی۔ دشمن کو دھکیلتا ہوا یہاں تک لے آیا۔ اور اس دن کے بعد اس وقت تک یہیں مقیم ہیں۔ اس محاذ کی داستان بیان کرنے والا اس سے زیادہ ثقہ راوی اور کون ہو سکتا تھا۔ اُس نے چشم دید واقعات سنانے ــــ وہ واقعات سنا رہا تھا اور ہم دم بخود ساکت وصامت کھڑے دل میں کہہ رہے تھے کہ یا اللہ! اب بھی تیرے بندوں میں ایسے جری اور بے باک موجود ہیں جو اس قسم کے محیر العقول کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں؟ یہ یقیناً اُسی آدم کی اولاد ہیں جس کے سامنے ملائکہ سجدہ ریز تھے۔

میں نے اس سے کہا کہ صوبیدار صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ آپ ۶ ستمبر کی صبح سے ۸ ستمبر کی شام تک مسلسل لڑتے رہے۔ اس دوران میں کھانے پینے کا کیا رہا؟ یہ سُنکر اس نے میری طرف عجیب حیرت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور مسکرا کر صرف اتنا کہا کہ میاں صاحب! کھانا پینا بیکار وقت کا مشغلہ ہے۔ کام میں اس کا خیال تک بھی نہیں آتا۔ چنوں کی پوٹلیاں میرے پاس تھیں۔ تین دن تک بندھی کی بندھی رہ گئیں۔

نہ کسی نے لی نہ کسی نے دی جو بھری تھی خم میں بھری رہی

میں نے کہا کہ ہمارے (وہ) اگلے سپاہی دشمن کے سپاہیوں سے دو ہی قدم کے فاصلے پر ہیں۔ وہ تعداد

یں بہت زیادہ نظر آتے ہیں۔ وہ کوئی شرارت تو نہیں کرتے ؟ — کہنے لگا کہ ہاں! وہ ان سے چھ گنا زیادہ ہیں۔ لیکن صاحب! ہماری قسمت کہاں کہ وہ کوئی شرارت کریں۔ ان کم بختوں سے تو غلطی سے بھی کوئی فائر نہیں ہوتا۔ ہم تو تنگ آ گئے ہیں۔ آپ ہی سوچیئے کب تک کوئی لبلبی پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہے!

اس میدان میں چاروں طرف سناٹا تھا۔ فضا پر وحشت طاری تھی۔ یہ حالت دن میں تھی۔ رات کو یہاں کس قدر خوفناک تاریکی ہو گی' اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے — میں نے کہا — صوبیدار صاحب! آپ لوگوں کو تنہائی نہیں ستاتی۔ یہ سُن کر اس نے عجیب انداز سے میری طرف دیکھا اور ایک ایسی آواز سے جس میں اعتماد کی پوری قوت جھلک رہی تھی، کہا کہ تنہائی! یہ آپ نے کیا کہا۔ ہم تنہا نہیں ہیں' ہمارے ساتھ دس کروڑ پاکستانیوں کی دعائیں ہوتی ہیں۔ یہ ہمیں نہ کبھی اداس ہونے دیتی ہیں نہ مایوس۔ ہم کبھی تنہا نہیں ہوتے۔ آپ سب بھائی ہمارے ساتھ ہوتے ہیں — ہم تو جیتے ہی آپ کے سہارے ہیں۔

وہ یہ کہہ رہا تھا اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ میں نے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کے ہاتھ چومے۔ لیکن زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں بھی نم آلود تھیں۔ ان میں خوشی کے آنسو تھے۔

شام ہو رہی تھی۔ ہم نے بچوں کی فرمائش پوری کرنے کے لئے وہاں سے کچھ تحائف اکٹھے کئے — ٹوٹے ہوئے ٹینکوں کے ٹکڑے۔ چلے ہوئے کارتوس۔ توپ کے گولوں کے خول — ان سے بڑھ کر اور کیا تحائف ہو سکتے تھے!

راستے میں شام ہو گئی تو سڑک کے کنارے کچھ سپاہی کھانا لے کر بیٹھے تھے۔ ہم نے سلام کیا تو وہ ہمیں گھیر کر کھڑے ہو گئے کہ صاحب! کھانا کھا کر جائیے۔ ہم نے بڑی معذرت کی اور کہا کہ گاڑی ہمارے پاس ہے۔ ہم ابھی گھر پہنچ جائیں گے۔ آپ جنگل میں ہیں' آپ کھانا کھلیئے۔ لیکن وہ بھلا کب چھوڑنے والے تھے۔ کھانا الگ رکھ کر بیٹھ گئے کہ جب تک آپ شریک نہیں ہوں گے ہم نہیں کھائیں گے۔ اس کے کیا معنی کہ ایک بھائی کھا رہا ہو اور دوسرا سامنے کھڑا دیکھ رہا ہو۔

اس کے کیا معنی کہ ایک بھائی کھا رہا ہو اور دوسرا سامنے کھڑا دیکھ رہا ہو۔

اس ان پڑھ سپاہی نے نہایت سادگی سے یہ الفاظ کہے اور نہ معلوم مجھے کہاں سے کہاں لے گیا۔ میں نے جی میں کہا کہ اے کاش! یہ بات کہیں ہماری سمجھ میں آجاتے تو آج ہی دنیا کی تاریخ کچھ سے کچھ ہو جاتے۔ اسلام یہی تو کہنے آیا تھا کہ دیکھنا! ایسا نہ ہو کہ ایک شخص کھا رہا ہو اور دوسرا سامنے کھڑا دیکھ رہا ہو!

سپاہی مصر تھے۔ ہم حیران کہ ان کے کمانڈر نے مفاہمت کی راہ نکالی اور ہم سے کہا کہ صاحب! آپ

ایک ایک لقمہ لے لیجئے۔ یہ اس کے بغیر نہیں کھائیں گے۔

وہ ایک لقمہ میرے لئے حاصلِ زیست تھا ـــــ ایک مردِ مجاہد سے ہم نوالہ ہونے کی سعادت ـــــ

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں!

(۱)

چونڈہ

جنگ کے ان محاذوں کو دیکھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جب تک میدانِ کارزار کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا جائے اس امر کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے جانفروش مجاہدوں نے کس قسم کے محیّر العقول کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ اس جنگ میں سیالکوٹ سیکٹر میں ٹینکوں کی جو بے پناہ مڈبھیڑ ہوئی تھی اور ہمارے کوہ پیکر نوجوانوں نے جس بے جگری اور سرفروشی سے اس کا مقابلہ کیا تھا، اس کی داستانوں کی گونج مدت تک سنائی دیتی رہے گی۔ اس لئے اس محاذ کو دیکھنے کو بھی جی چاہتا تھا۔ لیکن محاذ پر جانے کا فائدہ اسی صورت میں ہے کہ..... کوئی فوجی افسر ساتھ ہو ـــ کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا ـــ ہماری خوش بختی سے، اس محاذ پر ہمارے دو قرآنی دوست تعینات تھے۔ ان کے حسنِ توسط سے ہماری یہ خواہش بھی پوری ہو گئی۔

۲۰ نومبر کی صبح ہم اس محاذ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں ڈسکہ کے مقام پر، ایک قرآنی رفیق ملک ضیاء اللہ صاحب کا مکان سڑک کے کنارے واقع تھا۔ انہوں نے ازراہِ حسنِ تواضع ناشتہ کے لئے روک لیا۔ تنہا ناشتہ کی کشش تو شاید ہمارے لئے عناں گیر نہ ہوتی لیکن ان کی چھوٹی چھوٹی بچیوں نے جس معصومانہ انداز سے ہمارا پُرتپاک استقبال کیا، اس نے نہ صرف یہ کہ ہمیں آگے بڑھنے نہ دیا بلکہ ہم وہاں کافی دیر تک رُکے رہے۔ کس قدر خوش بخت ہے وہ گھرانا جس کی فضا قرآنی فکر سے معمور ہو۔

طے یہ تھا ہمیں پسرور کے ریلوے اسٹیشن پر فوجی راہ نما مل جائیں گے تاکہ ہم بآسانی آگے جا سکیں۔ ڈسکہ میں جو ہمیں کچھ دیر ہو گئی تو ہم نے دیکھا کہ ان راہ نماؤں کی جیپ پسرور سے ڈسکہ کی طرف چلی آ رہی ہے ـــ اور جیپ میں سپاہی نہیں تھے ـــ خود ہمارے معزز میزبان تھے۔ اس گرمجوشی سے ملے کہ ان کے پسینے کی حرارت نے ہمارے عروقِ جامد میں خونِ زندگی دوڑا دیا۔ کس قدر صحیح کہا تھا حکیم الامت نے کہ

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

وہاں سے ہم سیدھے چونڈہ گئے ـــ جسے سیالکوٹ کی ٹینکوں کی جنگ کہا جاتا ہے وہ درحقیقت چونڈہ کے میدان میں لڑی گئی تھی ـــ ہمارے قومی ترانوں میں چونڈہ کا نام ضرور آنا چاہیئے تھا ـــ قصبہ بے آباد تھا۔

اس کے باہر ایک ٹیلہ پر چڑھے تو سامنے وہ وسیع و عریض میدان تھا جس میں یہ محیر العقول اور عدیم النظیر معرکہ سر ہوا تھا۔ جموں کی اطراف سے نیچے اتریئے تو سامنے میلوں لمبا چوڑا میدان ہے۔ بالکل ہموار۔ نہ کوئی ٹیلہ نہ چٹان۔ نہ ندی نہ نالہ۔ حتیٰ کہ درخت بھی کہیں کہیں اکا دکا کھڑے ہیں۔ اس قسم کا میدان ٹینکوں کی لڑائی کے لئے بڑا سازگار ہوتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ دشمن نے اس یورش کے لئے اسی میدان کو منتخب کیا تھا۔ وہ پہلے ہلہ میں چونڈہ تک پہنچ چکا تھا۔ شہر اور ریلوے اسٹیشن اس کے قبضہ میں تھا کہ ہمارے جاں باز وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے پھر جو کچھ کر کے دکھایا آسمان کی آنکھوں نے کاہے کو اس سے پہلے کبھی دیکھا ہوگا۔ تعداد میں کہیں کم۔ ساز و یراق کی کوئی نسبت ہی نہیں۔ دوسرے محاذوں پر لڑنے کے بعد یہاں پہنچے ہوئے۔ تھکے ماندے۔ لیکن عقاب کی نگاہیں اور چیتے کا جگر لئے ہوئے، خدا کی اس صفت کے مظہر کہ۔ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ (۲/۲۵۵) نہ اس پر اونگھ غالب آتی ہے نہ نیند۔ ہمارے دونوں میزبان دوست (جو اعلیٰ افسر ہیں)..... شمشیر بکف اور کفن بدوش اس محاذ کے اندر تھے۔ انہوں نے ایک ایک مورچہ پر پہنچ کر جو "آپ بیتی" سنائی ہے تو باور کیجئے، ہمیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ اسی دنیا کے رہنے والے تھے۔ لیکن اس "آپ بیتی" میں اپنے کارناموں کا ذکر محض برسبیلِ تذکرہ اور وہ بھی انتہائی انکسار کے ساتھ، سارا (CREDIT) اپنے رفقاء کو دیتے ہوئے۔ اور رفقاء کا یہ عالم کہ وہ رہ رہ کر ہمارے کانوں میں کہتے چلے جاتے تھے کہ یہ سب کچھ انہوں نے خود کیا تھا، ہمارا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ کیسی حسین و دلکش تفسیر تھی۔ یہ یؤثرون علیٰ انفسھم کی (کہ مومنوں کی شان یہ ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں)۔

میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ ہماری فوجوں نے جو کچھ کر کے دکھایا ہے، آپ کے نزدیک اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ یہ کیسے ہوا؟ انہوں نے کہا کہ اس کے وجوہ و علل تو بہت سے ہیں لیکن ان میں ایک عنصر ایسا ہے جو میرے نزدیک بڑا اہم ہے۔ لڑائی کا عام نقشہ یہ ہوتا ہے کہ سب سے آگے پیدل سپاہی ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے چھوٹے افسر۔ جوں جوں پیچھے ہٹتے جایئے، افسروں کا درجہ بڑھتا جاتا ہے۔ مثلاً سب سے آگے کیپٹن۔ اس سے پیچھے میجر۔ پھر کرنیل۔ پھر بریگیڈیئر۔ حتیٰ کہ جرنیل کا مورچہ یا ہیڈ کوارٹر، محاذ جنگ سے میلوں پیچھے ہوتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ دشمن کے مقابلہ میں ہماری تعداد بہت کم ہے۔ ہم نے لڑائی کا نقشہ الٹ دیا۔ ہم نے افسر اور سپاہی کا امتیاز اٹھا دیا۔ چنانچہ افسر اگلی صفوں میں سپاہیوں کے دوش بدوش کھڑے تھے۔ ہمارے سپاہیوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ایک زخمی افسر کو بچانے، حتیٰ کہ ایک افسر کی لاش دشمن کے قبضے سے چھڑانے کے لئے بیسیوں سپاہی اپنی جان دے دیتے ہیں۔ ان سپاہیوں نے جب

دیکھا کہ افسر خود ان کے ساتھ شانہ بشانہ لڑ رہے ہیں تو انہوں نے ان سے بھی آگے بڑھ کر موت کو گلے لگایا۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے افسروں کی اموات (شہادت) کی نسبت اس قدر زیادہ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے۔ اور یہی وجہ درحقیقت ہماری اس قدر حیرت انگیز کامیابیوں کی ہے۔

ہمارا دوست یہ کچھ بیان کر رہا تھا اور میرے سامنے قرآن کریم کے اس مقام کے رموز و اسرار ایک ایک کر کے کھلتے جا رہے تھے جہاں اس نے کہا ہے کہ لقد کان لکم فی رسول اللہِ اسوۃ حسنۃ (۳۳/۲۱)۔ جنگِ احزاب میں مسلمان فوج پر (قرآن کے الفاظ میں) "ایسا سختی کا وقت آگیا کہ دشمن کے لشکر چاروں طرف سے امنڈ کر آ گئے تھے۔ خوف کے مارے ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا اور دہشت سے ان کے دل اس طرح دھک دھک کر رہے تھے گویا وہ اچھل کر حلق تک آپہنچیں گے۔" ایسے حوصلہ شکن اور ہمت طلب حالات میں ان کا کمانڈر (یعنی حضور نبی اکرمؐ) بہ نفس نفیس ان کے شانہ بشانہ چٹان کی طرح کھڑا تھا اور دشمن کی یلغار کی تلاطم انگیزیاں اس کے پائے ثبات میں ذرا سی لغزش پیدا نہیں کر سکی تھیں۔ یہ تھا وہ مقام جہاں ان مجاہدوں سے کہا گیا کہ

کس قدر حسین تھا وہ نمونہ جو تمہارے رسول نے تمہارے لئے پیش کیا تھا۔

اور حضور رسالتمآبؐ کے اسی اسوہ حسنہ کا اتباع تھا جس نے ہماری حالیہ جنگ میں لڑائی کا نقشہ الٹ دیا تھا۔

۔ میں یہ کہہ رہا تھا اور میرے دوست کے چہرے پر مسرتوں کی سُرخی پھیل رہی تھی۔ ایک مسلمان کے لئے اس سے بڑھ کر باعثِ مسرت و امتنان اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ اس کا قدم، حضور رسالتمآبؐ کے اتباع میں اُٹھا اور اس کا ایسا خوشگوار نتیجہ سامنے آیا۔ میرے دوست نے فخر و مسرت کے ملے جلے جذبات سے کہا کہ "آپ نے آج کس طرح ہماری نگاہوں کا رُخ پھیر دیا ہے۔ میرے رفقائے ہم عنان کو ان کے اقدام کی اس درخشندہ تعبیر سے کس قدر خوشی ہوگی"۔

ہم اس میدان کے ولولہ انگیز ماحول میں پھر رہے تھے اور جس مقام پر کوئی محیر العقول کارنامہ سامنے آتا تھا، ان مجاہدوں کے لئے، جن میں سے کچھ اُس وقت بھی ہمارے ساتھ ہی تھے، میرے لب پر بے ساختہ زمزمۂ تبریک و تہنیت آجاتا تھا۔ ان میں ایک نوجوان افسر تھا۔ بڑا تیز اور ذہین۔ اس نے مجھ سے کچھ رازدارانہ انداز سے، آہستہ سے کہا کہ مجھے ایک بات بتایئے۔ آپ ہمارے ان کارناموں پر، قدم قدم پر ہماری تعریف و توصیف کے گیت گا رہے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ غیب کی قوتوں نے کیا۔ ہمارا نشانہ ٹھکانے لگا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ گولہ ہمارے توپچی نے نہیں پھینکا تھا کسی سبز پیرہن بزرگ نے پھینکا تھا۔ ہم نے اپنی جانیں دے کر، دشمن کو پسپا کیا تو وہ ہم نے نہیں کیا، سفید گھوڑیوں پر سوار روحانی فوج نے کیا۔

جب یہ سب کچھ ان غیبی قوتوں نے کیا تو اس میں ہمارا (CREDIT) کیا ہے! میں نے دیکھا کہ اس کی اس تنقید میں طنز سے کہیں زیادہ ملال اور افسردگی کا پہلو نمایاں تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ اف! یہ افسانے (جنہیں خواہ بطور سازش پھیلایا گیا ہو یا برنائے جہالت) کس قدر حوصلہ شکن نتائج پیدا کر گئے ہیں۔ ہمارے وہ جاں باز مجاہد، جنہیں اپنے کارناموں پر فخر سے سر اٹھا کر چلنا چاہیئے تھا، ان افسانوں سے ان کے دل بجھ گئے ہیں۔ یہی وہ خطرہ تھا جس کے پیشِ نظر طلوعِ اسلام نے یہ کہا تھا کہ

ان حقیقتوں کو افسانے نہ بننے دیجئے

مجھے بتایا گیا کہ ان سپاہیوں نے یہ کچھ صرف اخبارات میں نہیں پڑھا، ہمارے جو بزرگ ان محاذوں کو دیکھنے آئے ہیں، انہوں نے بھی ان سے یہی کچھ کہا ہے اور اس سے ان پر غیر شعوری طور پر بڑا حوصلہ شکن اثر ہوا ہے۔

میں نے اس نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ عزیزم! ذرا اتنا سوچو کہ اگر یہ کارنامے ان غیبی قوتوں نے سرانجام دیئے ہیں تو پھر "نشانِ حیدر" میجر عزیز بھٹی (شہید) اور "ہلالِ جرأت" ملک اختر کو کیوں دیا جاتا ہے؟ نوجوان بڑا ذہین تھا۔ ایک ثانیہ میں بات کی تہ تک پہنچ گیا اور کہنے لگا کہ "پھر قوم میں یہ (DUAL PERSONALITY) کیوں کارفرما ہے؟" میں نے کہا کہ اس کے متعلق، میں تفصیل سے، فرصت کے وقت بات کروں گا۔

اور یہ فرصت مجھے اس وقت مل گئی جب ہم میس کے باہر، دوپہر کے کھانے کے بعد بیٹھے۔ اس مجلس میں، اوفیسرز بھی تھے اور جوان بھی۔ اس سے پہلے، فوجیوں کے اس قسم کے ریمارکس بھی مجھ تک پہنچ چکے تھے کہ ہم سترہ برس تک کامل، اپنے اہلِ وطن کے طعن سنتے رہے۔ کوئی کہتا کہ یہ فوجی مفت میں بیٹھے قوم کی گاڑھے پسینہ کی کمائی پر عیش اڑا رہے ہیں۔ کہیں سے آواز آتی کہ ان سے نہریں کھدوائیے۔ کوئی کہتا کہ ان سے سڑکیں کٹوائیے۔ پچھلے دنوں فوج کی تنخواہوں میں اضافہ ہوا تو ملک میں ایسے کہرام مچ گیا گویا فوج نے قوم کو لوٹ لیا ہے۔ ہم یہ سب کچھ سنتے تھے لیکن زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس لئے کہ جب تک کوئی معرکہ سامنے نہ آئے، فوج کیا بتا سکتی ہے اور کیسے بتا سکتی ہے کہ اس کی اہمیت کیا ہے۔ خدا خدا کر کے یہ موقع ملا کہ ہم اپنی ہستی کا جواز اور اپنے مقام کی اہمیت کا مظاہرہ کر سکیں۔ ہم نے ایسا کیا اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اہلِ ملک نے، جنگ کے دوران، اس کا دل کھول کر اعتراف کیا۔ لیکن جونہی جنگ ختم ہوئی، یہ حکایتیں پھیلنی شروع ہو گئیں کہ یہ سب کچھ غیبی قوتوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ فوج کا اس میں کیا ہے؟ اس سے ہم پھر اسی مقام پر آ گئے جہاں پہلے تھے۔

میں اس قسم کی باتیں سن چکا تھا۔ اس لئے میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ضروری خیال کیا کہ

اس باب میں قرآنی حقیقت کو ان کے سامنے پیش کردوں۔ چنانچہ میں نے ان سے تفصیل سے باتیں کیں جن کا انداز یہ تھا کہ:

"عزیزانِ من! اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ انسانوں کی دنیا میں خدا کے پروگرام، غیبی قوتوں سے نہیں، بلکہ انسانی ہاتھوں سے سرانجام پاتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں دیکھئے۔ جہاں مسلمانوں کو سب سے پہلے جنگ کی اجازت دی گئی ہے وہاں کہا گیا ہے کہ "اگر اللہ ایسا انتظام نہ کرے کہ سرکش اور مستبد لوگوں کی روک تھام کے لئے، انسانوں کی جماعتیں، اٹھ کھڑی ہوں، تو کسی کا کچھ بھی محفوظ نہ رہے۔ آپ نے دیکھا کہ دنیا میں، مستبد قوتوں کی روک تھام کا انتظام، انسانی جماعتوں کے ذریعے کرایا جاتا ہے۔ اور دیکھئے! مکہ کے مظلوم، اپنی حفاظت کے لئے خدا سے فریاد کرتے ہیں اور خدا، مدینہ کے مسلمانوں سے کہتا ہے کہ تم سنتے نہیں کہ وہ کمزور و ناتواں، مظلوم خدا ان مظلوموں کی امداد کے لئے کوئی غیبی قوت نہیں بھیجتا۔ مدینہ کے مسلمانوں سے کہتا ہے کہ تم ان کی مدافعت کے لئے اٹھو۔ یہی وہ مجاہد ہیں جن کے متعلق وہ (خدا) کہتا ہے کہ یہ لوگ خوف و ہراس کے حوصلہ شکن حالات میں نہایت پامردی سے مقابلہ کے لئے کھڑے رہتے ہیں اس لئے ہم ان پر تہنیت و تبریک کے پھول برساتے ہیں (اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ)۔ اس کے برعکس ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی سپاہی، میدانِ جنگ سے، پیٹھ دکھا کر بھاگا تو وہ سیدھا جہنم میں جائے گا۔ ان تمام مقامات میں آپ نے دیکھا کہ میدانِ جنگ میں فتح و کامرانی کا سبب، ان مجاہدین کے ثبات و استقامت اور جانبازی و سرفروشی کو قرار دیا جاتا ہے نہ کہ کسی غیبی قوت کو۔ اور اسی کے لئے انہیں اس قدر تاکید کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان مجاہدین سے کہا تھا کہ اگر تم میں بیس سپاہی بھی جم کر، ثابت قدمی سے مقابلہ کریں گے تو وہ دشمن کے دو سو سپاہیوں پر غالب آجائیں گے۔ اس میں دیکھئے کہ دشمن کے دو سو سپاہیوں کو مغلوب کرنے کے لئے بیس ثابت قدم مجاہدین کی ضرورت لابدی قرار دی گئی ہے۔ یہ نہیں کہا کہ اگر تم میں سے کوئی بھی مقابلہ کے لئے کھڑا نہیں ہوگا تو بھی دشمن کے (کم از کم) ایک سو اسی سپاہی ہماری غیبی قوتوں سے تباہ کر دیئے جائیں گے۔ اور پھر ان بیس کے لئے استقامت اور ثبات کی شرط ضروری سمجھی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ساز و سامان کی موجودگی بھی۔ کیونکہ وہیں یہ کہہ دیا گیا کہ یہ ایک اور دس کی نسبت پورے ساز و سامان کے ساتھ ہے۔ سردست، جب تم میں ساز و سامان کی مقابلتہً کمی ہے، تم اپنے سے دوگنی تعداد پر بالضرور غالب آجاؤ گے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اس کی بھی تاکید کر دی کہ تم اپنی سرحدوں کو گھوڑوں کے رسالوں سے خوب مستحکم رکھو۔ (اُس زمانے میں بہترین استحکام کا یہی ذریعہ تھا)۔ یہ نہیں کہا کہ تم میدانِ جنگ میں چلے جاؤ۔

تمہاری سرحدوں کی حفاظت غیبی قوتیں کریں گی۔ اس لئے یاد رکھئے! اس جنگ میں جس قدر کامیابی ہوئی ہے، وہ آپ کی اور صرف آپ کی ہمتوں کا صدقہ ہے اور اس کا سہرا صرف آپ کے سر ہے۔ اس میں کسی "سبز پیرہن اور سفید قبا" والے کا کوئی دخل نہیں۔ آپ قوم کے نزدیک بھی درخورِ صد تعریف و ستائش ہیں اور خدا کے ہاں بھی مستحقِ ہزار درجات و مناصب۔

میں یہ کہہ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ ان کے چہروں پر سُرخی دوڑتی جا رہی ہے۔ ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو رہی ہے اور ان کے سینوں میں تازہ ولولے بیدار ہو رہے ہیں۔

ان میں سے ایک مجاہد نے (جو ذرا زیادہ عمر کا تھا) پوچھا کہ جس چیز کو تائیدِ خداوندی کہا جاتا ہے وہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ اس کے متعلق بھی اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر کام کے لئے قوانین مقرر کر دیتے ہیں۔ جو شخص ان قوانین کے مطابق کام کرتا ہے اس کا نتیجہ نفع بخش اور کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔ اسے تائیدِ خداوندی کہتے ہیں۔ یہ قوانین دو قسم کے ہیں۔ ایک قانون تو یہ ہے کہ جب آپ توپ کا رُخ ٹھیک کر کے، صحیح زاویہ کے مطابق، عین وقت پر گولہ چلائیں گے تو وہ ٹھکانے پر لگے گا۔ دوسرا قانون یہ ہے کہ اگر آپ عدل اور انصاف کی خاطر جنگ کریں گے، آپ کا مقصد مظلوموں کی امداد ہوگا اور آپ جنگ میں بلند اخلاق کو پیشِ نظر رکھیں گے تو آپ کے اندر ایسی قوتیں بیدار ہو جائیں گی جن سے آپ کا ایک ایک سپاہی دس دس کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ اسے کہتے ہیں "خدا کی راہ میں لڑنا"۔ اس طرح لڑنے والوں کو خدا نے "حزب اللہ" یعنی اللہ کا لشکر کہا ہے اور اس جنگ کو "خدا کی مدد کرنا" قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا ہے کہ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (۲۲/۴۰) "خدا یقیناً اس کی مدد کرے گا جو خدا کی مدد کرے گا"۔ یعنی جو لوگ ان مقاصد کی خاطر جنگ کریں گے جنہیں خدا نے اچھا قرار دیا ہے اور جنگ میں ان امور سے مجتنب رہینگے جن سے اس نے روکا ہے، تو انہیں ایسی جمعیتِ خاطر اور اطمینانِ قلب نصیب ہوگا جس سے ان کی ہمتیں بلند اور حوصلے زیادہ ہو جائیں گے اور خطرات کے مقابلہ کے وقت ان کے پاؤں میں لغزش نہیں آئے گی۔ اس کا نام تائیدِ خداوندی ہے۔ لیکن یاد رکھئے۔ اگر آپ "آپ کے گولے والے" قانون میں غلطی یا سستی کر جائیں گے تو اس کا نقصان ہو کر رہے گا۔ "جنگِ احد" میں، نبی اکرمؐ سپہ سالارِ اعظم تھے اور صحابہؓ کبار سپاہ۔ یہ لشکر حق و صداقت کے لئے میدان میں نکلا تھا اس لئے انہیں خدا کی تائید حاصل تھی۔ لیکن جب ان کے ایک دستہ نے ذرا سی غلطی کی تو ان کی فتح شکست میں بدل گئی (اور تو اور) خود نبی اکرمؐ کو بھی زخم آئے۔ کسی غیبی قوت نے انہیں، اس غلطی کے نقصان سے نہیں بچایا۔ حق کی خاطر لڑنا اور توپ کا رُخ صحیح رکھنا، اس سے جو خوشگوار نتائج پیدا ہوتے ہیں انہیں تائیدِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ اس طرح جنگ کرنے کا بھی سارا (CREDIT) مجاہدین کو ملتا ہے۔

ان مجاہدین کو جن کے ہاتھوں خدا کے پروگرام تکمیل تک پہنچتے ہیں. یہی وہ حقیقت ہے جسے علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

ایک نوجوان نے کہا کہ روحانی قوت بالآخر ہوتی ہی ہے نا! میں نے کہا کہ ہاں ہوتی ہے، لیکن وہ مجاہد کے دست و بازو میں ہوتی ہے. یہی وہ دست و بازو تھے جن کی حیرت انگیز قوت کو دیکھ کر خود خدا نے کہا تھا کہ "میدانِ جنگ میں تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم چلا رہے تھے. تم تلواروں کا وار نہیں کر رہے تھے، ہم کر رہے تھے." یاد رکھئے ـــ ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ ـــ آپ نے غور نہیں کیا کہ خدا نے مجاہدین کے گھوڑوں کے سموں سے اڑنے والے گرد و غبار کی قسم کھائی ہے. ان کے نعلوں سے اُبھرنے والی چنگاریوں کی قسم کھائی ہے. "روحانی قوت" کے مدعی کے تسبیح و مصلےٰ کی قسم نہیں کھائی. اس لئے مجاہد کا مقام سب سے اونچا ہے. آپ کا مقابلہ کون کرسکتا ہے.

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

(٥)

ان قرآنی بصائر کا نتیجہ تھا کہ جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے ہیں تو وہاں کی فضا بدل چکی تھی. یہاں پہنچنے کے بعد، مجھے جو خط موصول ہوا اس میں تحریر تھا کہ

اس رجمنٹ کے سب افسران اور جس جس جوان سے آپ ملے نہایت متأثر ہوئے ان کا (MORALE) تا بفلک جا پہنچا. (دوبارہ) جنگ سے پہلے کہیں آپ سے دو چار باتیں سُن لیں تو کم از کم اس یونٹ کے جوان بخوشی سر دھڑ کی بازی لگالیں.

مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا. فالحمد للہ.

(٥)

جنگِ احد میں جب مسلمان مجاہدین کو اپنی ایک غلطی سے شکست ہوئی تو اس کا ان کے دل پر بُرا اثر ہوا. اس بد دلی کے ازالہ کے لئے قرآن کریم نے ان سے کہا کہ تم افسردہ خاطر کیوں ہوتے ہو. اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ۚ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳/۱۳۹). اگر آج تمہیں کوئی زخم لگا ہے تو اس سے پہلے اس قسم کا زخم تم فریقِ مخالف کو لگا چکے ہو. یہ جنگ کا میدان

ہے۔ اس میں پلڑے جھکتے اور اٹھتے رہتے ہیں۔ اگر کسی وقت، کسی غلطی یا لغزش سے، وقتی طور پر شکست ہو جائے تو اس سے ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔ دوسرے وقت میں اس کا ازالہ ہو جائے گا۔

واہگہ کی سرحد پر اپنا کچھ نقصان دیکھ کر مجھ پر جو کچھ تھوڑی سی افسردگی طاری ہوئی تھی، اس کا ازالہ کھیم کرن کا محاذ دیکھنے سے ہو گیا۔ سیالکوٹ کے محاذ پر ہمارا کچھ علاقہ دشمن کے قبضہ میں آگیا ہے۔ اس کا اثر زائل کرنے کے لئے مجھ سے کہا گیا کہ اب تم چھمب کا محاذ دیکھ آؤ۔ کھیم کرن میں اگر تمہیں "قَرۡحٌ مِّثۡلُهٗ" نظر آیا تھا تو چھمب میں تمہیں قَدۡ اَصَبۡتُمۡ مِّثۡلَيۡهَا ؕ (۳/۱۶۴) دکھائی دے گا یعنی جس قدر نقصان دشمن نے نہیں پہنچایا ہے اس سے دوگنا نقصان تم اسے پہنچا چکے ہو اور اگر راجستھان کو بھی ساتھ شامل کر لیا جائے تو پھر دشمن کا نقصان ہم سے چار گنا ہو جاتا ہے۔

چھمب جوڑیاں سیکٹر

چنانچہ ۲۲ دسمبر کی دوپہر ہم چھمب کے سیکٹر کی طرف روانہ ہوئے۔ رات جلالپور جٹاں میں گزاری۔ پروگرام تو یہی تھا کہ وہاں خاموشی سے رات گزار کر آگے چلے جائیں گے لیکن شدہ شدہ قرآنی احباب کو اطلاع مل گئی، اچھی خاصی محفل جم گئی۔ اس طرح قرآن کی باتیں بھی ہو گئیں اور بہت سے قدیمی دوستوں سے ملاقات بھی۔ جن تعلقات کی بنیاد، پرخلوص قرآنی رشتہ پر ہو ان میں بے لوث محبت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال کسی اور رشتے میں نہیں مل سکتی۔ چنانچہ یہ مختصر سی محفل اسی جذبہ کی حسین یادگار تھی۔ اس پر ہمارے میزبانِ عزیز میر عبدالغنی صاحب اور محترم مرزا غلام حسین صاحب کا حسنِ تواضع، وجہِ نشاطِ قلب و نظر تھا۔ اس پُرسرور فضا میں رات بسر ہوئی اور [illegible] کی صبح ہم جانبِ منزل روانہ ہو گئے۔

جلال پور جٹاں سے قریب دس میل کے فاصلہ پر (بمقام ٹانڈہ) ہمارے فوجی راہنما مل گئے —— ایک نہایت ذہین، پرخلوص اور شگفتہ مزاج فوجی ڈاکٹر جن کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس محاذ کی پوری جنگ میں وہ بذاتِ خود شریک تھے۔ اس لئے وہ راستہ بھر فوج بیتی نہیں بلکہ (یوں کہیئے) کہ آپ بیتی سناتے چلے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ فوجی معرکہ آرائی کا صحیح اندازہ ہو ہی اس وقت سکتا ہے کہ میدان کارزار آپ اپنے قدموں سے ناپیں۔ اور حدی خواں وہ ہو جس نے اس معرکہ میں خود حصہ لیا ہو۔ ٹانڈہ سے تھوڑی دور آگے بڑھے تھے کہ سڑک کے کنارے ایک طرف، سُرخ حروف میں نوشتہ ایک کتبہ نظر آیا جس پر لکھا تھا

"LIBERATED AREA"

[illegible] ان حروف پڑھیں اور زبان پر ندائے آسمانی کی یہ نشید جانفزا کہ و اورثکم ارضھم د

دیارھم و اموالھم و ارضًا لم تطؤھا (۳۳/۲۷) "اس نے تمہیں ان دشمنوں کی زمینوں کا، ان کی بستیوں کا، ان کے مال و دولت کا وارث بنا دیا اور اس سرزمین کا بھی جس پر ہنوز تمہارے قدم نہیں پڑے تھے۔" ایک طرف یہ حیات آور احساس اور دوسری طرف اس کتبہ کے الفاظ کا حسنِ انتخاب، جو گذشتہ اٹھارہ سال کے ماجریات کی مُنہ بولتی تصویر تھے۔

میری نگاہ نے جھک جھک کے کروائے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حسنِ یار ہوا

تھوڑی دور آگے چھمب کا ویران شدہ قصبہ تھا جس کے تھانے میں ہماری پولیس تھی۔ اس تھانے کی تصاویر اس علاقہ کی فتح کے ساتھ، سب سے پہلے اخبارات میں شائع ہوئی تھیں۔ اب وہ خود ہمارے سامنے تھا، اندر گئے تو تھانے کے انچارج پولیس افیسر نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ چائے کی پیشکش کی لیکن آگے بڑھنے کی شدتِ اشتیاق نے معذرت خواہی پر مجبور کر دیا۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہاں سے جوڑیاں، جو ہمارے سفر کی آخری منزل تھی، بارہ تیرہ میل کے فاصلے پر تھا لیکن ہمارے عزیز راہنما نے، بہ کمالِ شفقت کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پورے راستے کو دیکھیں جس سے ہماری فوجیں گزر کر جوڑیاں پہنچی تھیں۔ تاکہ سارے محاذ کا نقشہ آپ کے سامنے آجائے۔ اور سفر کے بعد جا کر اس کا احساس ہوا کہ یہ ہمارے اس رفیقِ محترم کا خلوص تھا جس کی وجہ سے انہوں نے یہ راستہ اختیار کیا۔ وہ راستہ جس کا طے کرنا۔ لانا تھا جوئے شیر کا۔ ورنہ اگر وہ ہمیں سیدھے جوڑیاں لے جاتے تو ہم پھر بھی ان کے شکر گزار ہوتے۔ لیکن اس طرح ہم وہ کچھ دیکھ لیتے جسے ہم شاید دوبارہ نہ پا سکتے۔

اس راستے کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ہم قریب ساٹھ میل کی مسافت طے کر کے جوڑیاں پہنچے تھے۔ اس تمام سفر میں بیشتر حصہ ایسا تھا جس میں سڑک تو ایک طرف، نہ کوئی پگڈنڈی تھی نہ نشانِ راہ۔ سارا راستہ پہاڑی نالوں کے بڑے بڑے پتھروں سے پٹا پڑا تھا جن پر سے جیپ گزرتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے زلزلہ آرہا ہے۔ پھر ان پتھروں میں سر و قد سرکنڈے کے "جنگل"۔ واقعی جنگل جن میں چار قدم تک بھی نگاہ صاف نہیں جا سکتی تھی۔ یہ تھا ہماری فوجِ ظفر موج کا محاذِ جنگ۔ تھوڑی دور آگے گئے تو پیر جمال کی سطح مرتفع پر دشمن کا پہلا مورچہ نظر آیا۔ مورچہ کیا تھا ایک زمین دوز چھاؤنی تھی۔ لیکن اب اس کے صرف کھنڈرات باقی تھے۔

راستہ کے پتھروں سے ٹکراتے اور سرکنڈے کے جنگل کو چیرتے، میلوں آگے گئے، تو سامنے کی پہاڑی پر دشمن کے پختہ مورچوں کے باقیات دکھائی دیئے اور نیچے ایک وسیع آبادی کی شکستہ، سرنگوں عمارات، جن

میں اِدھر اُدھر فوجی بکتر بند گاڑیوں کے ڈھانچے بکھرے پڑے تھے۔ یہ دیوا کی چھاؤنی تھی جو دشمن کا بٹالین ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس مقام پر ان سے سخت تصادم ہوا تھا۔

ان کھنڈرات میں ایک طرف ایک چوکھنڈی کے اندر ایک مزار تھا ــــ کم از کم پینتیس چالیس فٹ لمبا۔ اس کے سرہانے "پیر کافی شاہ" کندہ تھا اور چاروں طرف تازہ جلی ہوئی موم بتیوں کے باقیات اس حقیقت کے غماز کہ یہ خانقاہ اب مرجع انام بن رہی ہے ــــ اس قسم کی گولہ باری میں اس کا محفوظ رہ جانا ــــ مدفون پیر صاحب کی کرامت کی زندہ شہادت بن جانے کے لئے کافی تھا ــــ اصل یہ ہے کہ دنیا میں توہم پرستی کے خالق اسی قسم کے اتفاقی حادثات ہوتے ہیں اور پھر مرورِ زمانہ سے یہی اتفاقات اور ان سے منسلک خود تراشیدہ افسانے کرامات بن جاتے ہیں۔

یہاں سے آگے بڑھے، تو دریائے توی کے کنارے منڈیالہ کراسنگ پر پہنچے۔ اس مقام پر بھارتی ایک بہت بڑا پل بنا رہے تھے۔ اس کی بنیادوں کے ستون ہمارے سامنے کھڑے تھے اور تعمیر کا باقی سامان کنارے پر پڑا ہر راہ رَو سے کہہ رہا تھا کہ

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہے
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

دریائے توی یوں تو ایک پہاڑی نالہ ہے۔ لیکن اس کا خشک پاٹ بتا رہا تھا کہ برسات کے دنوں یہ ایک سیلِ بے پناہ بن جاتا ہوگا۔ ہمارے جیوش خدامست نے اسے ستمبر کے شروع میں عبور کیا تھا۔ اسے پار کیا تو سامنے وہ سڑک (پہاڑی راستہ کہیئے) تھی۔ جو جوڑیاں کی طرف جا رہی تھی۔ چند میل آگے بڑھے تو دُور سے پہاڑی کے اوپر ایک قدیم قلعہ نظر آیا۔ اسے قلعہ کلیت کہتے ہیں۔ دروازے پر لفٹننٹ کرنل شیورام سنگھ (مارچ ۱۹۳۳ء) لکھا تھا ــــ مارچ ۱۹۳۳ء کی بات سمجھ میں نہ آئی۔ کیونکہ قلعہ کی عمارت تو سینکڑوں برس پرانی دکھائی دیتی تھی۔ قلعہ کے اوپر چڑھے تو اس کے محلِ وقوع کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اس وقت مطلع ابر آلود تھا۔ ورنہ (کہتے تھے کہ) وہاں سے گجرات، سیالکوٹ، جموں تک کی آبادیاں نظر آجاتی تھیں۔ اب بھی ہمارے سامنے بیسیوں میل کا علاقہ تھا۔ قلعہ کی پوزیشن ایسی تھی کہ اس پر اگر ایک سپاہی مشین گن لے کر کھڑا ہو جائے، تو نیچے کتنی ہی فوج ہو، کسی کو قریب تک نہ آنے دے۔ لیکن ہمارے عساکر کے سیلِ رواں کے سامنے یہ قلعہ بھی ریت کی دیوار سے زیادہ مضبوط ثابت نہ ہوا ــــ یقینِ محکم اور عزمِ راسخ دنیا میں کیا کچھ کر دکھاتا ہے!

اس سے ذرا آگے بڑھے، تو سامنے جوڑیاں کا ویران شدہ قصبہ تھا جس کے ڈاک بنگلہ میں اب ہمارا فوجی ہیڈ کوارٹر تھا۔ لیکن جوڑیاں تک پہنچنے سے پہلے ذرا رُکیئے اور دیکھئے کہ وہ سامنے کیا نظر آتا ہے؟

یہ ٹروٹی کی پہاڑی ہے جس پر یہاں سے وہاں تک چاروں طرف تین تین منزل کے پختہ مورچے تھے۔ یہ مورچے دشمن کا قلعہ تھے جس کے دامن میں جوڑیاں کا قصبہ تھا۔ اس پہاڑی کے نیچے سے گذر کر جوڑیاں کو فتح کرنا اور پھر اس سے آگے اکھنور تک جا پہنچنا ـــ کم از کم ہمارے ذہن میں تو نہیں آسکتا تھا کہ یہ کیسے ہوگیا۔ ہم اس ورطۂ حیرت میں گم تھے کہ ہماری جیپ ڈاک بنگلہ کے احاطہ میں جا پہنچی۔ وہیں او فیسرز میس تھا۔ ہم نے جہاں بھی اپنے جیالے نوجوانوں کو دیکھا ـــ وہ افسر تھے یا جوان ـــ انہیں ہر جگہ شگفتہ و شاداب پایا۔ مجھے کہیں کسی ایک جگہ بھی کوئی ایسا فوجی نظر نہیں آیا جو افسردہ یا تنگ مزاج ہو۔ اس دن لندن بی بی سی کا ایک نمائندہ بھی بغرض سیاحت وہاں آیا ہوا تھا۔ زیادہ وقت اسی کے ساتھ گفتگو میں گذرا۔ خوراک کے مسئلہ پر بھارت کے واویلے کا ذکر آیا تو ایک افسر نے کہا کہ ہمیں اتنا معلوم ہے کہ جب ہم نے اس مقام (جوڑیاں) پر قبضہ کیا ہے تو یہاں شہری گوداموں کے اندر اس قدر فاضلہ غلّہ بھرا پڑا تھا جو ان سے دو تین سال تک بھی ختم نہ ہوتا۔ (یہی کچھ ہم نے کھیم کرن میں سُنا تھا)۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ بھارت کی چیخ و پکار کہاں تک مبنی برحقیقت ہے۔ شہری آبادی کا ذکر آیا تو انہوں نے بتایا کہ ہمارے قبضہ کرنے سے پہلے یہ قصبہ خالی ہوچکا تھا۔ البتہ یہاں تیس چالیس بوڑھے بوڑھے مرد اور عورتیں موجود تھیں۔ یعنی ان کے عزیز رشتہ دار خود تو جان بچا کر بھاگ گئے اور اپنے سن رسیدہ بزرگوں کو پیچھے دشمن کے حوالے کر گئے ـــ بعینہٖ یہی کچھ ہم نے کھیم کرن میں سنا تھا۔ اس سے آپ ہندو قوم کی ذہنیت کا اندازہ لگائیے۔ عقیدہ ان کا یہ ہے کہ مہاراج رام چندر نے اپنے پتا کے بچن کا پالن کیا۔ (یعنی اپنے والد کے دیئے ہوئے قول کو نبھایا) تو وہ ایشور کے اوتار ہوگئے۔ اور عمل ان کا یہ کہ بھاگتے وقت اپنے بوڑھے والدین کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ ماں باپ تو ایک طرف ان کی حالت یہ ہے کہ یہ گائے کو ماتا کہتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے۔ لیکن اس ماتا کے ساتھ ان کا سلوک یہ ہوتا ہے کہ (ہم ہندوستان میں دیکھا کرتے تھے کہ) جب تک وہ دودھ دیتی اسے پاس رکھتے۔ لیکن جونہی وہ بوڑھی ہوجاتی اسے یا تو دوسروں کی نظر بچا کر قصابوں کے ہاتھ بیچ دیتے اور یا گھر سے باہر نکال کر آوارہ چھوڑ دیتے ـــ جو قوم اپنے دیوی دیوتاؤں کے ساتھ یہ کچھ کرے۔ وہ عام انسانوں کے ساتھ جس قسم کا سلوک کرے گی ظاہر ہے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد، ہم جوڑیاں کے اجڑے ہوئے قصبہ کو دیکھنے گئے۔ قصبہ چھوٹا سا تھا لیکن برباد شدہ عمارات کے کھنڈرات بتا رہے تھے کہ یہاں کے رہنے والے اچھے خوشحال ہوں گے۔ لیکن کھیم کرن کی طرح یہ قصبہ بھی وجعلناھم احادیث کا عبرت انگیز مرقع تھا۔ یعنی ان بستیوں کی اب صرف داستانیں باقی رہ گئی تھیں۔ دُور سے سڑک کے کنارے وہ مسجد[1] دکھائی دی جس کی بابت اخبارات میں اکثر پڑھا تھا۔ بتایا گیا کہ یہ بڑی

[1] یہ وہی مسجد تھی جس کے متعلق ہندوستان نے شور مچایا تھا کہ پاکستانی افواج نے صبح آٹھ بجے بمباری کی اور مسجد میں نمازیوں

خستہ حالت میں پائی گئی تھی اور اس میں ایک موچی بیٹھتا تھا۔ اب ہمارے مجاہدین کے حسنِ عقیدت اور جوشِ عمل نے اسے بڑی پاکیزہ عمارت میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس مقام سے آگے قریب چار میل تک ہمارا قبضہ ہے لیکن فائر بندی کے سلسلہ میں ہندو جس انداز سے معاہدہ کا "احترام" کر رہا ہے اس کے پیشِ نظر۔۔۔ اب سیاحوں کو آگے نہیں جانے دیا جاتا۔ ہمارے زیرِ قبضہ علاقہ سے آگے قریب تین میل سامنے اکھنور کا مشہور قصبہ ہے۔ یہاں ہم نے اپنے جاں فروش سپاہیوں سے اکھنور کے معرکہ کے تفصیلی حالات سنے۔ انہیں اکھنور سے اِدھر رک جانے کا اس قدر افسوس تھا کہ میں نے دیکھا کہ اس کا ذکر آتے ہی وہ شدتِ جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ زبان سے تو کچھ نہیں کہتے۔ لیکن بے تابانہ نظر سے وہ اکھنور کی سمت دیکھتے ہیں۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک بندھے ہوئے شیر کی طرح اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ اگر ایک دفعہ فائر بندی کی آئینی زنجیر کھول دی جائے تو یہ جموں سے ورے دم ہی نہ لیں۔ وہ یہ سننے کے لئے مضطرب و بیتاب نظر آتے تھے کہ فائر بندی کے احکام کب واپس لئے جائیں گے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ ۔۔۔ سینہ شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا۔

دن ڈھل رہا تھا اس لئے ہمیں واپس آنا پڑا۔ اگرچہ جی نہیں چاہتا تھا۔ واپسی اس راستے سے ہوئی جو سیدھا چھمب تک جا پہنچتا ہے۔ صاف، سیدھا، ہموار راستہ ۔۔۔ نہ کہیں ٹیلے نہ پتھر، نہ ندی نالے نہ سرکنڈا سارا علاقہ نہایت سرسبز و شاداب۔ وادیٔ کشمیر میں جو کچھ نورجہاں کے دستِ حنائی اور جہانگیر کے ذوقِ رعنائی نے کیا ہے اگر اس سے قطع نظر کر لی جائے، تو شادابی اور دلکشی میں یہ علاقہ اس سے کم نہیں۔ بلکہ اس اعتبار سے اس سے بھی زیادہ جاذب کہ یہاں ہر طرف آموں کے پیڑ ہیں جو وادی میں نہیں ملتے۔ آم تو اس سارے علاقہ میں بڑی افراط سے پھیلا ہوا ہے۔ راستے میں کھوڑ اور پلاں والا کی بھارتیوں کی تباہ شدہ چھاؤنیاں دیکھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اٹھارہ سال سے مسلسل جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ یہ سب کچھ دیکھتے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ اس حسین و شاداب علاقہ کی لطف اندوزی سے ابھی دامنِ نگاہ پُر بھی نہیں ہوا تھا کہ ہم دریائے توی پار کر کے چھمب کے تھانے کے سامنے کھڑے تھے۔ یہاں ذرا رکے اور دو اہم نکات پر نگہ بازگشت ڈالئے۔

(گذشتہ صفحے کا فٹ نوٹ) کو ہلاک کر دیا۔ اوّل تو آٹھ بجے دن کے کوئی نماز ہی مسجد میں نہیں ہوتی اور پھر اس مسجد میں تو موچی بیٹھتا اور جوتے گانٹھا کرتا تھا۔

لہ یہ رک جانا اس لئے تھا کہ لاہور کی حفاظت کا تقاضا تھا کہ وہاں کی فوجوں کو فی الفور اس طرف منتقل کر دیا جائے۔ اگر یہ فوری ضرورت لاحق نہ ہوتی تو اس وقت نقشہ کچھ اور ہوتا۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ لاہور کی حفاظت کے لئے ہمیں کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ ہمیں امید ہے کہ موقعہ آنے پر اہلِ لاہور اس قرض کو بہ حسن و خوبی ادا کر دیں گے۔ یہ احسان فراموش نہیں ہیں۔

ایک تو یہ کہ اس سیدھے راستے سے ہماری فوجیں گھنٹہ بھر میں جوڑیاں تک پہنچ سکتیں تھیں۔ انہوں نے اس راستے کو چھوڑ کر وہ راستہ کیوں اختیار کیا جس کی دشوار گزاریاں اس قدر ہمت طلب اور حوصلہ شکن تھیں۔ یہ اس لئے کہ اس طرف سے آتے ہوئے اس بین الاقوامی حدِ فاصل (باؤنڈری لائن) کو توڑنا پڑتا تھا جسے قائم رکھنے کا پاکستان عہد کر چکا تھا۔ دوسری طرف آزاد کشمیر کا علاقہ تھا جس میں اس قسم کی کوئی پابندی ہم پر عائد نہیں ہوتی تھی۔ آزاد کشمیر کی افواج ادھر سے بڑھ رہی تھیں اور ہم ان کی مدد کے لئے پہنچے تھے۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ پاکستان بین الاقوامی معاہدات کا احترام کس طرح کرتا ہے۔ وہ ہمارے علاقے کے اندر اعوان شریف کے گاؤں پر بمباری کر چکا تھا۔ اب کون سا امر مانع تھا کہ ہماری افواج سیدھی ان کے علاقہ میں نہ چلی جاتیں لیکن ہم نے اس پر بھی ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس ہندوؤں کی طرف سے معاہدات کے سلسلہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔

اور دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس محاذ پر ہماری فوجوں نے جو محیر العقول کارنامے کر کے دکھائے اس کی مثال بھی تاریخ میں شاید ہی کہیں اور ملے۔ چھمب سے لے کر جوڑیاں تک ہم نے ہر مقام پر دیکھا کہ دشمن کے مورچے پہاڑیوں اور بلند ٹیلوں پر تھے اور ہماری فوجیں نشیب کی طرف سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ جو شخص فنونِ جنگ سے کچھ بھی واقف نہ ہو وہ بھی بآسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان حالات میں مقابلہ کس قدر سخت اور معرکہ کس قدر جرأت آزما تھا۔ لیکن ہماری فوجوں کو کسی ایک مقام پر بھی شکست نہیں ہوئی۔ وہ درانہ آگے بڑھتی گئیں اور دشمن بھیڑ بکریوں کی طرح ان سے آگے آگے انتہائی بدحواسی کے عالم میں بھاگتا چلا گیا۔ اکثر مقامات پر اس طرح کہ توپ میں گولہ ڈالا ہوا ہے لیکن اسے توپ داغنے کی بھی مہلت نہیں ملی یا اس کا ہوش نہیں رہا۔ اور وہ اسے ویسے کا ویسا چھوڑ کر بھاگ اٹھا۔ دیوا کا پہاڑی مورچہ، منڈیاکہ کراسنگ کا حصن حصین، کلیت کا سربفلک قلعہ، ٹروٹی کی پہاڑیوں کے تین تین منزلہ پختہ مورچے سب دھرے کے دھرے رہ گئے اور ایک بار پھر وہ معرکہ کہن تازہ ہو گیا۔ جس کے ضمن میں قرآن نے کہا تھا کہ قذف فی قلوبھم الرعب (اس نے دشمن کے دلوں میں تمہارا رعب ڈال دیا) جو گروہ موت کے ڈر سے بے خوف ہو کر آگے بڑھے گا اس کی ہیبت سے پہاڑوں کے دل دہل جائیں گے۔ اسی کا مظاہرہ اس محاذ پر ہوا۔ اور یہ سب کچھ تین چار دن کے اندر ہو گیا۔ حالانکہ ایسا طویل اور فرہاد طلب راستہ اتنے عرصہ میں بحالتِ اطمینان بھی بمشکل پیدل طے ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس محاذ کو دیکھ کر یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ہر چند ساز و یراق اور شمشیر و سناں بھی جنگ کے لئے لازمی ہے لیکن فیصلہ کن ہاتھ ان انسانوں کا ہی ہوتا ہے جو اس سامان اور اسلحہ کو استعمال کرتے ہیں اور ہمارے ہاں وہ انسان (فوجی سپاہی) موجود ہیں جن کا مقابلہ شاید ہی دنیا کا کوئی اور سپاہی کر سکے۔ پاکستانی افواج کے شیر دل مجاہدو!

قوم کو آپ پر بجا طور پر ناز ہے۔ تم زندہ و سلامت ہو تو پاکستان ہر خطرہ سے محفوظ و مامون ہے۔ اللہ تمہیں زندہ سلامت رکھے۔ تم جہاں بھی ہو ــــ دس کروڑ انسانوں کی حسین تمنائیں اور تابندہ آرزوئیں تمہارے ہمرکاب ہیں!

دیدۂ بینائے قوم علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ــــ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی ــــ ان محاذوں کو دیکھ کر یہ دعوے ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ 'نم' قرآنی اقدار کے پاک اور صاف زندگی بخش چشمہ کے سوا اور کہاں سے مل سکتا ہے۔ خدا ہمیں اس چشمۂ حیات سے زیادہ سے زیادہ بہرہ یاب ہونے کی سعادت نصیب کرے۔ والسّلام

حدیث النّبیؐ

رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

إِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوهَا وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَهِكُوهَا وَ حَدَّ حُدُودًا فَلَا تَعْتَدُوهَا وَ سَكَتَ عَنْ أَشْيَاءَ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوا عَنْهَا۔

اللہ نے تم پر کچھ فرائض عائد کئے ہیں انہیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے' ان کے پاس نہ پھٹکو۔ کچھ حدود مقرر کی ہیں' ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے اور اس نے ایسا دانستہ کیا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ انہیں بیان کرنا بھول گیا ہے۔ ان چیزوں کے متعلق خواہ مخواہ کرید نہ کرو۔

بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اعزاز الدین احمد خاں

ایہہ پُتر ہٹاں تے نئیں وِکدے

جنگ ۱۹۷۱ء

ایک جوان کی سچی کہانی

چھمب (آزاد کشمیر) کا محاذ

جب ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہند و پاک کی تیسری جنگ چھڑی، تو ۴۔ پنجاب رجمنٹ، ۲۳ ڈویژن کے تحت چھمب محاذ پر پیشقدمی کے لئے تیار کھڑی تھی۔ حکم ملتے ہی، ۴ پنجاب نے جنگ بندی لائن عبور کی اور دشمن پر ٹوٹ پڑی۔ دیکھتے ہی دیکھتے، ۷ دسمبر ۱۹۷۱ء تک ۲۳ ڈویژن نے نہ صرف چھمب پر قبضہ کر لیا بلکہ دریائے توی تک سارا علاقہ بھارتی فوج سے آزاد کرا لیا۔ ۴۔ پنجاب نے اس پیش قدمی میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا اور دشمن کی کئی اہم چوکیوں پر قبضہ کر لیا جس سے بھارتی فوجیوں کے پیر اکھڑ گئے۔

کمانڈر ۲۳ ڈویژن میجر جنرل افتخار جنجوعہ (ستارۂ جرأت) بھاگتے ہوئے دشمن کو سانس لینے کا موقعہ نہیں دینا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے ۱۱۱ برگیڈ کو حکم دیا کہ ۹ اور ۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کی درمیانی رات کو دریائے توی کے دوسرے کنارے پر ایک "برج ہیڈ" (BRIDGE HEAD) بنائے یعنی دریائے توی کے دوسرے کنارے پر اتنے بڑے علاقہ پر قبضہ کرے جس میں سے گزر کر ہماری ٹینک رجمنٹ دشمن کا پیچھا کر سکے۔ اس حملے میں بھی ۴ پنجاب رجمنٹ کو پہلے کی طرح، اہم کردار ادا کرنا تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ اس حملے کی کامیابی کا انحصار بہت حد تک اس کے مجاہدوں کے عزم اور حوصلے پر تھا۔

حملے کے لئے تیاریاں زوروں پر تھیں کہ ۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام کو اطلاع ملی کہ ڈویژن کمانڈر میجر جنرل افتخار جنجوعہ افسروں اور جوانوں سے ملنے کے لئے آگے رہے ہیں۔ سب اپنے نڈر اور دلیر کمانڈر کے منتظر تھے کہ اطلاع آئی کہ وہ نہیں آ سکیں گے کیونکہ وہ اپنے ربِ حقیقی کے پاس چلے گئے ہیں! ان کا ہیلی کاپٹر اترتے ہوئے ایک درخت سے ٹکرا

گیا تھا جوان کی شہادت کا باعث بنا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اس مردِ مجاہد کی آخری خواہش اس کے سوا کچھ اور نہ تھی کہ "حملہ پلان کے مطابق کیا جائے تاکہ دشمن کو پیر جمانے کا موقعہ نہ مل سکے۔" سب آنکھیں اشکبار تھیں لیکن کسی نے حوصلے کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اپنے کمانڈر کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ۴ پنجاب اور ۱ بلوچ رجمنٹ (۱۱۱ بریگیڈ) نے وقتِ مقررہ پر دشمن پر بھرپور حملہ کیا۔ دریائے توی میں اپنے "گھوڑے دوڑا دیئے"۔ وہ گھمسان کا رن پڑا' الامان' الحفیظ۔

۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کا سورج جب طلوع ہوا تو ۴ پنجاب کے مجاہد دریائے توی کے دوسرے کنارے سے سینکڑوں گز آگے نکل چکے تھے۔ دشمن کی ۹ جاٹ رجمنٹ کا صفایا ہو چکا تھا۔ اس حملے کی کامیابی میں ۴ پنجاب کے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل رشید کا بڑا ہاتھ تھا۔ ایک بار جب حملہ رک گیا تو کرنل رشید نے حاضر دماغی اور دلیری کا ثبوت دیتے ہوئے ایک انٹی ٹینک گن کو خود اپنی نگرانی میں' دریائے توی کے پار لے گئے اور اس سے دشمن کے ان بنکروں (BUNKERS) کو اڑا دیا جو حملے کو روکے ہوئے تھے۔ پھر کیا تھا' دشمن کی ۹ جاٹ رجمنٹ' اپنا سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گئی۔ میدان ۴ پنجاب کے ہاتھ رہا جس نے وقت ضائع کئے بغیر' "برج ہیڈ" میں پوزیشنیں سنبھال لیں تاکہ دشمن کے جوابی حملہ' اگر آئے' کا مقابلہ کیا جا سکے اور اپنی ٹینک رجمنٹ کو' مرحوم جنرل کی پلان کے مطابق (LAUNCH) آگے بھیجا جا سکے۔

اس معرکہ میں ۴ پنجاب کو گو خاصا نقصان ہوا۔ ۲۹ مجاہدوں نے جامِ شہادت نوش کیا اور ۶۲ زخمی ہوئے۔ لیکن اس کے افسروں اور جوانوں کے حوصلے ہمیشہ کی طرح بلند تھے۔ جو کارنامہ انہوں نے سرانجام دیا تھا اسے دشمن نے بھی سراہا۔ "برج ہیڈ" میں اپنی پوزیشنوں کو ترتیب دیتے ہوئے' جب کمانڈنگ افسر' دشمن کے ایک زخمی حوالدار کے قریب سے گزرے تو انہوں نے رُک کر اس کی خیریت دریافت کی۔ زخمی حوالدار نے بمشکل اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

"صاحب! مبارک ہو آپ نے بھارتی فوج کی بہترین پلٹن کو مات دی ہے۔"

کمانڈنگ افسر نے دل ہی دل میں زخمی دشمن کی اپنی پلٹن سے محبت کو سراہا اور کہا "جوان! تمہاری پلٹن کو پاکستان کی بہترین پلٹن نے مات کیا ہے۔" یہ سنکر زخمی حوالدار کے چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا "صاحب ایک درخواست ہے۔"

کمانڈنگ افسر: "ہاں۔ کہو۔"

زخمی حوالدار: "صاحب مجھے گولی مار دیں' میں اس کرب اور اذیت کو مزید برداشت نہیں کر سکتا۔"

کمانڈنگ افسر پہلے تو یہ درخواست سُنکر ذرا چونکے اور پھر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

"ہم قیدیوں کو مارا نہیں کرتے ان کا دھیان رکھتے ہیں۔"

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور انٹی ٹینک رجمنٹ ابھی تک (LAUNCH) نہیں ہوئی تھی۔ اس ٹینک

پلان بدل گئی

رجمنٹ کو ۴ پنجاب کی برج ہیڈ کی پوزیشنوں میں سے گزر کر دشمن کی طرف بڑھنا تھا یہ دیکھتے ہوئے کہ دشمن ۱۰ بلوچ رجمنٹ کے سامنے ابھی تک موجود تھا۔ اپنے ٹینکوں کا آگے بڑھنا اور بھی ضروری تھا۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔ یہ خدشہ اب تقویت پکڑ رہا تھا کہ پلان تبدیل ہو گئی ہے۔ یہ خدشہ درست ثابت ہوا۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کی سہ پہر کو حکم ملا کہ ۴ پنجاب "برج ہیڈ" کی پوزیشنوں کو خالی کر کے دریائے توی کے پیچھے آجائے!! ناقابلِ یقین حکم! کمانڈنگ افسر نے بریگیڈ کمانڈر سے رابطہ قائم کیا اور پرزور الفاظ میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے کہا۔ "دشمن تو بھاگ رہا ہے ہم ان کی گنوں اور ٹرکوں کو پیچھے جاتے دیکھ رہے ہیں ہمیں تو آگے بڑھ کر اس کا پیچھا کرنا چاہیئے لیکن ہمیں پیچھے ہٹنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ کیوں؟ پنجاب نے جو کامیابی حاصل کی ہے اسے EXPLOIT کرنا چاہیئے تاکہ ۱۰ بلوچ کے سامنے دشمن کا دباؤ کم ہو۔ پھر انہوں نے نہایت ہی جذباتی انداز میں کہا "للہ! ہمارے شہیدوں کے خون کو یوں رائیگاں نہ جانے دیجئے۔ میں کس منہ سے اپنے جوانوں کو پیچھے ہٹنے کا حکم دوں" بریگیڈ کمانڈر نے انہیں بڑے تحمل سے سنا پھر صرف اتنا کہا۔ "میں حکم کی تعمیل کر رہا ہوں آپ بھی ایسا ہی کریں!" اور یہ بھی بتایا کہ انہیں جو اطلاعات ملتی ہیں ان کے مطابق دشمن ایک بڑے جوابی حملے کی تیاریاں کر رہا ہے جس میں ٹینک کے دستے بھی شامل ہیں اور چونکہ ۱۰ بلوچ رجمنٹ کو ابھی تک خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے ۴ پنجاب کا "برج ہیڈ" میں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے اس لئے آپ کو واپس آنے کے لئے کہا جا رہا ہے۔ صاف عیاں تھا کہ جنرل افتخار کی شہادت کے بعد لڑائی کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ ایک دن پہلے جو ڑیاں تک کا علاقہ ہمارے قدموں میں تھا اور دوسرے دن بہت دُور! ۴ پنجاب کے کمانڈنگ افسر نے دل پر پتھر رکھ کر پلٹن کو پیچھے ہٹنے کا حکم دے دیا۔ "WITHDRAWAL" دشمن کی گولہ باری کے باوجود، خیر و خوبی سے مکمل ہوا۔ یہ ۱۰ دسمبر کی رات تھی۔

سپاہی کا وعدہ

دریائے توی کے دوسرے کنارے پہنچ کر جب جوانوں کی پڑتال کی گئی تو پتہ لگا کہ سپاہی غلام رسول، جس کے پاس راکٹ لانچر تھا، واپس نہیں آیا ہے۔ (راکٹ لانچر پلاٹون کی سطح پر ٹینک مار ہتھیار ہے)۔ متعلقہ کمپنی کمانڈر نے سپاہی غلام رسول کے پلاٹون حوالدار کو حکم دیا کہ وہ دو سپاہی ساتھ لے کر واپس "برج ہیڈ" پوزیشنوں میں جائے اور غلام رسول کو ڈھونڈ کر واپس لائے۔ حوالدار اور اس کے ساتھیوں نے ایک بار پھر برستی آگ میں، دریائے توی کو عبور کیا۔ دیکھ بھال کرتے ہوئے جب وہ "برج ہیڈ" میں اپنی سابقہ پوزیشنوں میں پہنچے، تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ سپاہی غلام رسول اپنے راکٹ لانچر کو تیار پوزیشن میں کئے ہوئے، مورچے میں کھڑا ہے۔ اُسے اس حالت میں کھڑے دیکھ کر، حوالدار کے ذہن میں یہ خیال گزرا کہ کہیں غلام رسول کا دماغ تو نہیں چل گیا کیونکہ کوئی شخص، اپنے ہوش و حواس میں،

اندھیری رات میں' ایک ایسے مقام پر اکیلا کھڑا نہیں ہوگا جہاں ایک طرف تو دشمن کی وقفہ وقفہ سے گولہ باری ہو رہی ہو اور دوسرے جہاں دشمن کے ٹینک اور سپاہی کسی وقت بھی آسکتے ہوں۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط نکلا۔ جیسے ہی وہ سپاہی غلام رسول کے مورچے کے قریب آیا تو اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ پوچھے غلام رسول بولا۔

" استاد آپ کیوں آئے ہیں۔ میں اپنا کام کر کے خود ہی آجاتا۔"

حوالدار: "کیسا کام؟ پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم اکیلے یہاں کر کیا رہے ہو؟"

سپاہی: " میں اکیلا تو نہیں ہوں' اللہ میرے ساتھ ہے۔ میں دشمن کے ٹینکوں کا انتظار کر رہا ہوں۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ دشمن ٹینکوں سے جوابی حملہ کرنے والا ہے۔"

حوالدار: ہاں کہا تھا۔ لیکن تم اکیلے کیا کرلو گے؟"

سپاہی: (تھوڑی خاموشی کے بعد) " پلٹن واپس نہ جاتی تو میرا کام آسان ہوتا۔ لیکن اب تو یہ کام مجھے اکیلے ہی کرنا پڑے گا... میں اپنا وعدہ پورا کر کے ہی واپس جاؤں گا۔"

حوالدار: " کیسا وعدہ .... ؟"

سپاہی: پھر وہی خاموشی .... ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے جواب کو تول رہا ہو۔ پھر آہستہ سے بولا " ماں سے وعدہ۔"

حوالدار: " ماں سے وعدہ ..... ؟"

سپاہی: " ہاں' استاد' میری ماں مجھے بتایا کرتی ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والے یا تو دشمن کو قتل کر کے واپس آتے ہیں یا خود اپنی جان دے دیتے ہیں ...." تھوڑی دیر خاموشی کے بعد " میں نے اپنی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ اس لڑائی میں' میں اپنے راکٹ لانچر سے' دین کے ان دشمنوں کے ایک یا دو ٹینک ضرور برباد کر کے واپس آؤں گا!! میری ماں نے مجھے ڈھیر ساری دعائیں دی تھیں۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ پھر کہنے لگا " مجھے اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے اس سے بہتر موقعہ شاید ہی پھر ملے۔ اس لئے میں یہیں رک گیا تھا۔" کچھ سوچ کر پھر بولا " استاد! آپ واپس جائیں' میں آجاؤں گا۔ انشاء اللہ.... اور اگر میں واپس نہ آیا تو میری ماں کو ضرور بتا دینا کہ میں نے اپنا وعدہ پورا کرنے کی پوری کوشش کی تھی...." اس کی آواز پھر بھرا گئی۔

حوالدار یہ سب کچھ ایک سکتے کے سے عالم میں سُن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے جن پر وہ قابو نہ رکھ سکا۔ جب اس نے اپنے جذبات کو سپاہی سے چھپانے کی کوشش کی تو اس کے بسنے میں گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ اس نے اپنا ماتھا منڈیر پر رکھ کر اپنے جذبات کے سیلاب کو روکنے کی کوشش کی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جذبۂ ایمانی سے سرشار ایسے نوجوانوں کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ ان کے ساتھ تو خدا ہوتا ہے اور خدا کا بھلا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ کچھ دیر بعد جب اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو اس کی نظر سپاہی غلام رسول پر پڑی' جو

بدستور ٹکٹکی باندھے، اپنے سامنے یوں دیکھ رہا تھا، جیسے اس کا مطلوب، رات کی تاریکی کو چیرتا ہوا کسی لمحے اس کے سامنے آ کھڑا ہوگا۔

حرفِ آخر

یہ ہے ایک ہلکی سی جھلک ہمارے ان مجاہدوں کی جو ہماری جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کے محافظ ہیں۔ یہ ہیں وہ مردانِ کارزار جو ہمارے مکار ہمسایہ فطرت دشمن کو ارضِ پاک سے دُور رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ہیں وہ شیر دل نوجوان، جو آج ہماری آزادی اور ہماری غلامی، ہماری عزت اور ذلت کے درمیان روک بنے ہوئے ہیں۔ یہ قوم کے بڑے مہنگے بیٹے ہیں۔ ان کی قدر کیجئے۔

بقول صوفی تبسم:

ایہہ پُتر ہٹاں تے نئیں وکدے

حدیثُ النّبیؐ

رسول اللہ (صلعم) نے فرمایا۔

جس بستی میں کسی ایک فرد نے بھی اس حالت میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اس بستی سے اللہ کی حفاظت و نگرانی کا ذمہ ختم ہوا۔

(مسندِ امام احمد)

افواجِ پاکستان کے نام

ہم ہیں حرفِ لَا اِلٰہ کے ترجمانِ بے خطر

ہم بہادر ہیں، دلاور ہیں، جری ہیں، نامور — ہم یداللہ ہیں ہمارے وار سارے کارگر
ہم شناسندۂ رفعت، ہم فضاؤں پر محیط — ہم شناور ہیں سمندر کے، امیرِ بحر و بر
ہمسری اپنی کرے گا کون ہم افلاک گیر — ہم ہوا کے دوش پر اڑتے ہیں، ہم شہباز گر
پاٹتے ہیں ہم خلاؤں کو بسلطانِ اذن گر — شش جہت غوغا ہے جب کھولیں پَے پرواز پر
دشمنانِ دین کو ہم سے خوف کھانا چاہیئے — ہم مجاہد ہیں، شہادت ہے ہماری معتبر
غایتِ ہستی ہماری امن کا پیغام ہے — ہادیٔ برحق ہمارے امن کے پیغامبر
سنّتِ معراج ہے تسخیرِ گردوں کی دلیل — ہم نئے افلاک گر ہیں ہم نئے آفاق گر
ہم ہیں بوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و حیدرؓ کے جواں — ہم خدا کے شیر ہیں، رکھتے ہیں چیتے کا جگر
نیند کے ماتے نہیں ہیں، ہم سدا بیدار ہیں — امتحاں لے گا اگر اپنا کبھی بیداد گر
ہم ہیں ارضِ پاک کے ذرّوں کی حرمت کے امیں — ہم ہیں حرفِ لَا اِلٰہ کے ترجمانِ بے خطر
ہم مکینِ لامکاں کے نام لیواؤں میں ہیں — ہم پہ آساں آسماں و کوہ و دریا، دشت و در
فطرتِ اَسدُ اللّٰہی ہیں، ضربتِ اَسدُ اللّٰہی — ہم ہیں سیف اللہ، ہم فتح مُبیں کے نقش گر
ہم سرِ میداں اترتے ہیں تو پھر رُکتے نہیں — ہم ہیں اللہ کے سپاہی، غازیانِ مفتخر
ہم جیالے ہیں، بڑھاتے ہیں قدم یکبارگی — کون ہیں عین الیقیں، حق الیقیں سے بے خبر
کون ہے وہ جس نے للکارہ ہمیں جنگاہ میں — کون چڑھ آیا ہے سر پر، ہم کو غافل جان کر

خون کے قطروں سے ہم دینگے حسابِ زندگی
غازۂ اسلام ہے خونِ شہیداں سربسر

غلام رسول ازہر

ملک حنیف وجدانی

اکیسویں صدی کے تقاضے اور قرآن

(نظریہ، قانون سازی اور قوّتِ نافذہ)

قسط نمبر ۷

۸۔ عورت! ایک انسانِ محترم! (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ اٰدَمَ۔ ۱۷/۷۰)

عورت کی انسانی تاریخی حیثیت کا جائزہ لینے کے لئے میں نے مشہور کتاب THE SPIRIT OF ISLAM کے پانچویں باب "عورت" سے استفادہ کیا ہے۔ آنربل سیّد امیر علی صاحب کی اس کتاب کا اُردو ترجمہ 'روحِ اسلامی' از ہادی حسین، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور نے شائع کیا ہے۔ اس کے چند نکات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ایتھنز میں عورت ایک اثاثہ تھی جو خرید و فروخت کیا جا سکتا تھا۔" (ص ۳۵۹)

۲۔ چونکہ ژند اوستا میں بیویوں کی کوئی حد مقرر نہ کی گئی تھی' لہٰذا ایرانیوں کے ہاں نہ صرف بیک وقت متعدد بیویاں ہوتی تھیں بلکہ ان کے علاوہ لاتعداد داشتہ عورتیں بھی۔" (ص ۳۶۲)

۳۔ یہودی بددی لڑکی اپنے والد کے گھر میں ایک نوکرانی کی حیثیت رکھتی۔ سِن بلوغ سے پہلے اس کے والد کو اختیار ہوتا تھا کہ جی چاہے تو اسے بیچ ڈالے۔" (ص ۳۶۶)

۴۔ یمن کے 'نیم یہودی' نیم صابی قبیلوں کے یہاں تو ایک عورت کے بہ یک وقت بہت سے مردوں کی بیوی ہونے کا دستور بھی تھا۔" (ص ۳۶۶)

۵۔ ہندوستان کے بھبوت ملنے والے جوگی' مشرقی ملکوں کے جٹا دھاری بیراگی اور بدھ مت کے سنیاسی سب غیر متاہل ہوتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ گھر بار اور اہل و عیال کے رشتے توڑے بغیر معرفت حاصل نہیں کی جا سکتی اور تجرد کی زندگی بسر کئے بغیر ابدیت کا نصیب ہونا ممکن نہیں۔" (ص ۳۸۰)

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عورت ان کے نزدیک گناہ کا سرچشمہ تھی یا اس سے بھی کچھ زیادہ!

۶۔ (رومی) بیوی کو طلاق لینے کا کوئی حق نہ تھا۔" (ص ۳۸۳)

۷۔ ٹرٹلین (TERTULLAIN) نے عورت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا۔

"وہ شیطان کا دروازہ۔ آدم کو شجرِ ممنوعہ کھلانے والی، قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی کرنے والی۔ انسان کو بگاڑنے والی ہے۔" (ص ۳۹۵)

۸۔ مردوں کے لئے سب سے بڑی خوبیاں بہادری اور فیاضی ہوتی تھیں اور عورتوں کا سب سے قیمتی زیور عصمت ہوتا تھا۔ اگر کسی قبیلے کی ایک عورت کی توہین ہوتی تھی تو اس جزیرہ نمائے عرب کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک غصے کی آگ بھڑک اٹھتی۔" (ص ۳۹۷)

ان عربوں کے ہاں ظہورِ اسلام کے بعد عورت کو وہ تمام حقوق حاصل ہو گئے جن کی نشاندہی کتابُ اللہ (قرآنِ کریم) میں کی گئی اور آج تک حقوق کا دھارا اسی طرف بڑھ رہا ہے۔ عالمِ اسلام میں عورت کو حقوق ملنے کے متعدی اثرات کا نتیجہ تھا کہ اقصائے عالم میں کہیں اسے وارثِ تخت کی جگہ ملی۔ کہیں بیسویں صدی کی پارلیمانی جمہوریت میں وہ وزیرِ اعظم کے عہدہ تک جا پہنچی۔ صدارتی طرزِ حکومت میں کہیں اس نے شکست کھائی اور کہیں صدرِ مملکت کی اعلیٰ ترین حیثیت پالی۔ لیکن انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ معاشرے میں جمہور عورتوں کے حقوق اور تلخیٔ دورِ ایام کے داغ آج تک نہ مٹ سکے۔ عورت انسان نما درندوں کی ہوس جنس کہتری کا شکار ہوئی۔ عورتوں کی اجتماعی آبروریزی کے بے شمار واقعات ہوئے اور پاکستان میں ایک اہم ازدواجی جنسی سکینڈل "زینب نور" نے تمام ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کو لرزہ براندام کر دیا۔

مؤقر اور روزنامہ نوائے وقت نے "ایوانِ وقت" میں اس سلسلے میں ایک مذاکرے کا اہتمام کیا جس کی تفصیل ۲۷ مارچ ۱۹۹۴ء کے پرچہ میں شائع ہوئی۔ اس کے کچھ نکات کے ذریعہ میں چند حقائق کو منظرِ عام پر لاتا ہوں۔ اس مذاکرہ میں میزبان کی حیثیت سے محترمہ رباب عائشہ صاحبہ نے خدمات سرانجام دیں۔ جبکہ شرکائے مذاکرہ میں محترمہ شہناز بخاری صاحبہ، محترمہ فوزیہ سعید صاحبہ، محترمہ مہوش صاحبہ، محترمہ فرحت چودھری صاحبہ، محترمہ نوشین صاحبہ، محترمہ ڈاکٹر شہناز صاحبہ اور محترمہ فرخندہ شمیم صاحبہ نے حصہ لیا۔

نکتہ ۱۔ عورت۔ انسان۔

محترمہ فرخندہ شمیم صاحبہ نے مذاکرے میں بتایا کہ

"ادارے ایسے عورتوں سے رابطہ کریں گے جن پر تشدد کیا جاتا ہو۔ اگر عورت ان اداروں میں جائے گی تو وہ مرد جو عورت کو انسان ہی تسلیم نہیں کرتا وہ ان اداروں کے خلاف ہو جائے گا۔" (نوائے وقت، ۲۷ مارچ ۹۴ء)

(مردوں کی طرف سے ان اداروں کے خلاف خدشات نہ ہونے کے برابر ہوں گے یا ان کا ازالہ کیا جا سکے گا)۔

محترمہ شہناز بخاری صاحبہ نے بتایا کہ

"ہم ابھی سے اپنے بچوں کو سکھانا شروع کر دیں کہ عورت "انسان" پہلے ہے، ماں بیٹی بعد میں ہے۔ اور اس میں ماں اور باپ دونوں کی ذمہ داری ہے کہ آنے والی نسل میں یہ باتیں منتقل کریں۔" (ایضاً)

عورت بحیثیت ایک "انسان محترم" پر ہم قرآنی نقطۂ نظر سے تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔ آیئے پہلے مذاکرے کے چند دیگر نکات کا بھی جائزہ لے لیں۔ اگر ان پر بھی قانون سازی ہو جائے تو ایک اچھی ابتدا ہو گی جس سے بہتوں کا بھلا ہونے کی راہ ہموار ہو گی۔ اس قانونی جواز کے معاشرتی آثار سے ایک تحریک پیدا ہو گی جو اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے لئے عورت کو بطور "انسانِ محترم" تیار کرنے میں کافی مدد دے گی۔

نکتہ ۲: عورت کی تعلیم اور تعلیم بالغاں۔

محترمہ فوزیہ سعید صاحبہ نے مذاکرے میں بتایا کہ

"میں یہاں ذرائع ابلاغ پر بہت بڑی پابندی عائد کرنا چاہتی ہوں۔ اس لئے کہ تعلیم تو ہمارے یہاں نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر ہم یہ سوچیں کہ ایک پچاس سال کی عورت کو تعلیمِ بالغاں میں داخل کر کے تعلیم یافتہ بنا دیں تو یہ نہیں ہو سکتا۔" (ایضاً)

وہ آگے چل کر کہتی ہیں۔

"ذرائع ابلاغ ایک ایسا ادارہ ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعے معاشرہ میں شعور پیدا کیا جا سکتا ہے۔" (ایضاً)

حال ہی میں انڈیا میں ایشیائی ممالک کی تعلیمی کانفرنس ہوئی۔ اس میں پاکستان کا تعلیمی اوسط نمبر سب سے پست ترین یعنی آخری تھا۔ پاکستان میں تعلیمی اوسط ۲۸ فیصد بتائی جاتی ہے جبکہ عورتوں میں یہ اوسط صرف ۸ فی صد ہے۔

ہمارے یہاں محراب و منبر سے آواز بلند کی جاتی ہے کہ "گود سے گور تک علم حاصل کرو۔" "علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین تک جانا پڑے۔" ان حضرات سے یہ بھی پوچھنا چاہیئے کہ صاحب! آپ کی اس سے کیا مراد ہے؟ اور یہ کہ ملک میں تعلیمِ بالغاں کے لئے قانون سازی اور تعلیم بالغاں کے اداروں کا قیام کیسے عمل میں لایا جائے۔ یعنی بات کو وعظ و نصیحت کے دائرے سے نکال کر "قانون و نظام" کے دائرے میں لائیے تب تبدیلی اور عمل کی ابتدا ہو گی۔ آج کم از کم پرائمری تعلیم کو لازمی قرار دینے کے لئے قانون سازی اشد ضروری ہے تاکہ ہمارے تمام لڑکے اور لڑکیاں علم کی بنیاد پر سنِ بلوغت میں داخل ہوں اور پھر ذرائع ابلاغ کی تحریک پر تعلیمِ بالغاں کے ذریعہ یہ فریضہ اور شوق ساری زندگی پورا کرنے کی اہلیت حاصل کر سکیں۔ علم ایک بہت خوشبودار پھولوں والا پودا ہے۔ جو اس کے قریب ہو جائے

وہ بار بار اس کے پاس جاکر خوشبو سے لطف اندوز ہونے کی بے تاب تمنا سینے میں جاگزیں کرلیتا ہے۔

نکتہ ۳: مظلوم عورتوں کے لئے سپورٹ سینٹرز۔

محترمہ شہناز بخاری صاحبہ نے مذاکرے میں بتایا کہ

"اب معاشرہ کو فیصلہ کرنا ہے کہ طلاق بہتر ہے یا "زینب نور" بہتر ہے۔ یہ سوچ کر کہ طلاق کی شرح بڑھ جائے گی ہم عورت کو بچانے کے لئے کچھ نہ کریں اور مزید "زینب نور" پیدا کرتے رہیں۔" (ایضاً)

وہ آگے چل کر بتاتی ہیں کہ

"میں بہت خوش ہوں کہ "زینب نور" کے مسئلہ پر محترمہ پرائم منسٹر صاحبہ آئیں اور انہوں نے کہا کہ ڈسٹرکٹ لیول پر سپورٹ سینٹرز بنائے جائیں۔ جہاں خواتین گھریلو تشدد، زنا بالجبر جیسے مظالم کی رپورٹ کرا سکیں۔" (ایضاً)

محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ وزیر اعظم پاکستان کے دور میں ایسے سینٹرز کا قیام عمل میں آجائے تو یقیناً اسے عورت کی زندگی کے لئے "نویدِ بہار" سے تعبیر کیا جائے گا۔ سینٹرز کی قانونی اور مالی حیثیت مستحکم ہونی چاہیئے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، اگر برطانیہ میں ایک کنواری ماں ایسے سینٹرز میں رپورٹ کرے تو اسے اور اس کے بچے کی پرورش کے لئے سرکاری انتظام کردیا جاتا ہے۔ خدا کرے ہمارا معاشرہ اس حد تک نہ ہی پہنچے۔ البتہ جو شادی شدہ خواتین تشدد کا شکار ہوکر شیر خوار بچوں کے ہمراہ بھاگ آتی ہیں ان کا مستقبل ضرور محفوظ کیا جانا چاہیئے۔ اس کی یہی صورتیں ممکن ہیں کہ

۱۔ بذریعہ عدلیہ وقانون ومصالحت خاوند سے ذرائع پرورش کا ممکن حصول!

۲۔ ان مظلوم خواتین اور بچوں کے لئے سالانہ بجٹ میں مخصوص کی گئی رقم کے بہتر مصرف سے اس کا حل نکالا جاسکتا ہے۔

۳۔ معاشرے سے عورت کی گداگری کو ختم کرنے کے لئے خصوصی تحقیقاتی سینٹرز کا قیام عمل میں لاجائے۔ بچوں والی عورت کا گداگری کرنا مسلم معاشرے پر ایسا داغ ہے جس کا کوئی جواز نہیں ہوسکتا۔

نکتہ ۴: عورت کا معیار! خوبصورتی یا کردار۔

محترمہ فرخندہ شمیم صاحبہ نے بتایا کہ

"لڑکیاں ایک دوسری سے بہت متاثر ہوتی ہیں۔ ایک دوسری کے خیالات کی نقل کرتی ہیں۔ لڑکیاں جب گروپ میں ہوتی ہیں اور ایک لڑکی بات کرتی ہے تو دوسری چار

سوچتی ہے کہ یہ تو غلط ہو گیا۔ ہمیں بھی اپنے بارے میں سوچنا چاہیئے کہ ہمیں کتنے لڑکے پسند کرتے ہیں۔ تو وہ بہت سی چیزیں گھڑتی بھی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس نظریہ کو ختم ہونا چاہیئے۔ یہ معیار نہیں ہونا چاہیئے۔ اس تصور کو اس طرح کم کیا جا سکتا ہے کہ ہماری بچیوں میں سولہ سال کی عمر کے بعد یہ تصور پیدا کر دیا جائے کہ حسن کا معیار پسندیدگی کا معیار نہیں۔ معیار آپ کا کردار ہے۔" (ایضاً)

وہ آگے چل کر کہتی ہیں۔

"تعلیمی اداروں میں تو بچوں کو کوئی ایسا مضمون نہیں پڑھایا جاتا جس میں یہ کہا جائے کہ کردار کی بھی کوئی تشکیل ہوتی ہے۔ اس تربیت کی ذمہ داری زیادہ تر ماں، بہن اور خالہ پر عائد ہوتی ہے۔" (ایضاً)

کردار بالکل آزاد زندگی سے نہیں بنتا، بلکہ "اقدارِ حیات" کی پابند زندگی میں اس کا بیج بویا جاتا ہے جو پھوٹ کر تناور درخت بنتا ہے۔ اس کی چھاؤں میں سکون پانے والی زندگی ہی باکردار ہوتی ہے۔ عقل اور کردار دونوں سکھائے جا سکتے ہیں اور سیکھے بھی جا سکتے ہیں۔ مثال سے یوں سمجھئے کہ

۱۔ درسِ عقلمندی

ماں، بچہ اور پانی کا گھڑا اٹھائے آ رہی تھی کہ راستے میں ایک مارنے والا اونٹ سامنے آ گیا۔ اس نے پانی کا گھڑا بچانے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن اونٹ قریب آ گیا۔ اس نے گھڑا پھینکا اور بچے کو اٹھائے دوڑ کر ایک بلند وٹ بندی پر پہنچ گئی۔ پھر شور مچایا اور پتھر مار کر اونٹ سے جان چھڑائی۔

نتیجہ:۔ اس نے گھڑا قربان کر کے خود اور بچے کو بچا لیا۔ گھڑے کی قیمت کم ہے اور انسانی جان کی زیادہ۔

کم قیمت والی یعنی تھوڑی چیز قربان کر کے بڑی کو بچا لینا عقلمندی ہے۔ درجہ بندی کی مسلسل مثالوں سے ہم نئی نسل کو درس گاہوں میں عقلمند بنا سکتے ہیں۔

۲۔ درسِ کردار

(۱) سڑک کے کنارے ایک بیوہ کی جھونپڑی تھی جو اپنے بچے اور دو بچیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ دُور سے ایک ٹرک سڑک پر سامنے آیا۔ دو آدمی اس کو دیکھ کر دوڑے اور ایک درخت کی ٹہنیوں میں چھپ گئے۔ جب ٹرک اس

درخت کے نیچے سے گزرنے لگا تو انہوں نے ٹرک پر چھلانگ لگادی اور ٹرک سے سودا سلف نیچے گرا کر خود بھی چھلانگ لگادی۔ ٹرک آگے بڑھتا رہا جب وہ جھونپڑی کے قریب پہنچا تو بیوہ اپنے بچوں کے ساتھ سڑک پر پہنچ گئی۔ عورت نے ٹرک ڈرائیور کو پیچھے کی طرف اشارہ کیا، تو ڈرائیور نہ سمجھ سکا۔ اس نے ٹرک روک کر عورت سے باتیں کیں۔ تب اسے پتہ چلا کہ ڈاکو اس کا مال لے کر ابھی ابھی سڑک سے غائب ہو گئے ہیں اور صرف ایک تھیلا سڑک پر پڑا رہ گیا ہے۔ ٹرک ڈرائیور نے تھیلا اٹھایا اور کہا کہ میں اکیلا ہوں ان ڈاکوؤں سے پھر نمٹ لوں گا۔ ہفتہ عشرہ بعد وہی ٹرک ڈرائیور پولیس کے ہمراہ اسی وقت پر اُدھر سے گزرا۔ ڈاکوؤں نے اسی طرح درخت پر سے دوبارہ چھلانگ لگائی تو چھپی ہوئی مسلح پولیس نے ان ڈاکوؤں کو دبوچ لیا۔ بیوہ عورت کو پولیس کی طرف سے اہم انعام اور تحفظ کا یقین دلایا گیا اور پولیس نے درخت بھی کٹوا دیا۔

نتیجہ:۔ عورت نے ڈاکوؤں کی نشاندہی کی لیکن خود تھیلا نہ اٹھایا بلکہ ٹرک ڈرائیور کو آگاہ کیا جو اسے انعام میں دے گیا۔ دوبارہ ڈاکوؤں کی گرفتاری پر مزید انعام اور تحفظ مل گیا۔

دیانتداری کے احیاء کے لئے یوں آگاہ کرنا ایک مستقل قدر ہے جس کا انعام عورت کو ملا۔ اگر وہ خاموش رہتی تو بزدل اور ذہنی بددیانت شمار ہوتی۔ جو حقائق کا جرأت سے سامنا نہ کرنے والی ہوتی۔ یہ درسِ کردار ہے جو اس نے عملی مظاہرہ سے دکھایا۔

(ب) ایک عورت سڑک کے کنارے چل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پرس تھا۔ دو آوارہ نوجوان اس کے پیچھے ہو لئے۔ عورت نے اندازہ لگا لیا کہ اب میری عزت خطرے میں ہے تو اس نے اپنا پرس ان کے سامنے دُور پھینک دیا۔ وہ اس کی طرف لپکے تو اس نے شور مچایا اور دوسری طرف بھاگنے لگے جس سے وہ ڈر گئے اور پرس لے کر فرار ہو گئے۔ اتنے میں کچھ آدمی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے اس عورت کو محفوظ طور پر گھر پہنچا دیا اور پولیس کو مطلع کر دیا۔

نتیجہ:۔ عورت نے عزت بچانے کے لئے پرس پھینک دیا۔ عزت کی قیمت زیادہ اور پرس کے اندر والی دولت کی قیمت بہرحال کم تھی۔ مستقل قدر اور مال و دولت میں مقابلہ آجائے تو مالِ دولت کو قربان کر کے قدر (عزت) بچا لینا باکردار ہونے کا ثبوت ہے۔

معاشرے میں ایسے مواقع آتے رہتے ہیں جن کے ذریعہ عملی طور پر کردار کی تربیت دی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے مستقل اقدار کی فہرست تیار کر کے تعلیمی اداروں کو مہیا کرنا مسلم محکمہ تعلیم کی ذمہ داری ہے۔ ایسی تربیت (ذرائع ابلاغ سے بھی) گھر اور سکول دونوں جگہوں پر دی جا سکتی ہے اور دی جانی چاہیئے۔

محترمہ فرخندہ شمیم صاحبہ کا یہ کہنا بجا ہے کہ

"تعلیمی اداروں میں تو بچوں کو کوئی ایسا مضمون نہیں پڑھایا جاتا"

اگر ہمارا نصابِ تعلیم صرف خواندگی کے معیار پر کلرک یا نقال پیدا کرنے والا نہ ہو تو اس نصابِ تعلیم میں ذہنی معیار کے مطابق مستقل اقدار کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ یوں مضمون نہ ہونے والا گلہ شکوہ ختم ہو جائے گا اور

مال صدقۂ جاں، جان صدقۂ آبرُو

کے تصور والا وہ خزاں نادیدہ چمنستانِ ارضی نصیب ہو جائے گا جو ہماری تمناؤں کا محور اور سعی و عمل کی بہترین کسوٹی ثابت ہوگا اور ظاہر ہے کہ صالح اعمال کا ایسا ہی فطری نتیجہ ہونا چاہیئے۔

نکتہ ۵، عورت کو مارنا۔

محترمہ فوزیہ سعید صاحبہ نے مذاکرے میں بتایا کہ

"مارنا معاشرے نے کیوں قبول کیا؟" (ایضاً)

یہ عورت اور مرد دونوں کی تربیت کا مسئلہ ہے جس کی طرف سے ہم سب غافل ہیں اور یہ سزا ہماری غفلت کا ہی نتیجہ ہے۔ جب مناسب تربیت کے بعد حقوق و فرائض اور مستقل اقدار پر عمل کرنے کا روشن پہلو سامنے آئے گا۔ تو نہ عورت مار کھائے گی اور نہ مرد پر مارنے کا الزام لگے گا۔ بحالتِ موجودہ بھی مارنے کا رواج قانونی طور پر ختم کیا جانا چاہیئے اور یہ بیسویں صدی کے اندر اندر ہی بہت ضروری ہے۔ (جاری ہے)

حدیثُ النّبیؐ

عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسولؐ اللہ سے پوچھا کہ کونسا اسلام بہتر ہے۔ آپ نے فرمایا یہ کہ بھوکے اور مہمان کو کھانا کھلا دے اور ہر اس شخص کو سلام کرے خواہ تو پہچانتا نہ ہو۔ (صحیح مسلم، کتاب الایمان)

پہلا حصّہ

عورت روایات کے آئینے میں

عیسائیت میں عورت کا مقام

بائیبل میں کہا گیا ہے کہ آدم اور اس کی بیوی جنّت میں تھے۔ شیطان نے آدم کی بیوی کو بہکایا اور آدم اپنی بیوی کی باتوں میں آکر بہک اور بھٹک گیا۔ اس بنا پر عیسائیت گناہِ اوّل کا مجرم عورت کو قرار دیتی ہے اور مرد کو اس سے بری الذمہ ٹھہراتی ہے۔ اس جرم کی بنا پر اس کے نزدیک عورت، دنیا میں تمام مصائب کا سرچشمہ ہے، اس لئے انتہائی قابلِ نفرت مخلوق۔ عیسائیت کا مقدس لٹریچر، عورت کے خلاف طعن و تشنیع سے بھرا پڑا ہے۔ ان کے بڑے بڑے (SAINTS) عورت کو ملعون و مردود قرار دینے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے جو وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے تجرّد کی زندگی بسر کی اور وہ بھی تجرّد کی زندگی کو وجہِ تقربِ خداوندی سمجھتے ہیں۔ انہی کے تتبع میں ان کے ہاں کی (NUNS) بھی تجرّد کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ یعنی "جنسی آلائش" سے دور رہتی ہیں۔

دنیائے عیسائیت میں، صدیوں تک یہ مسئلہ زیرِ بحث رہا کہ عورت میں روح بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ سینٹ پال کا قول ہے کہ "جو عورتیں غیر شادی شدہ ہیں یا بیوہ، میں انہیں تلقین کروں گا کہ میری طرح غیر شادی رہیں۔" اس کے بعد اس نے کہا:۔

> آدمی عورت سے پیدا نہیں کیا گیا، عورت آدمی سے پیدا کی گئی ہے۔ آدمی عورت کے لئے پیدا نہیں کیا گیا، عورت آدمی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ گرجے میں عورتوں کو خاموش بیٹھے رہنا چاہیئے، انہیں بولنے کی اجازت نہیں۔ قانون کی رُو سے انہیں مردوں کے مقابلہ میں کم تر درجہ پر رہنا چاہیئے۔ اگر انہیں کسی بات کے معلوم کرنے کی ضرورت پڑے تو گھر جاکر اپنے خاوندوں سے پوچھ لیا کریں۔ عورت کے لئے یہ بات بڑی بے عزّتی کی ہے کہ وہ گرجے میں بات کرے۔ (سینٹ پال)

ایک اور سینٹ (HIEVONYMUS) کا قول ہے کہ "عورت، شیطان کا دروازہ، برائیوں کی راہ اور بچھو کا ڈنک ہے۔" ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عورتیں بہشت میں نہیں جا سکتیں۔ اس سے یہ دشواری پیش آئی کہ پھر حضرت مریمؑ

کے متعلق کیا کیا جائے۔ سینٹ (THOMAS) نے اس کا حل یہ بتایا کہ حضرت مریمؑ اور ان کے تمام ان تمام عورتوں کو جو کفارہ پر ایمان رکھنے کی بنا پر بہشت میں جانے کے قابل قرار دی جائیں گی 'مرد بنا دیا جائے گا۔ بلکہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہاں تذکیر و تانیث کا امتیاز ہی اُٹھ جائے گا۔[1]

عیسائیوں کے ہاں تو ایسے عقائد پیدا ہونے ہی تھے لیکن انتہائی بدقسمتی کہ خود ہم (مسلمان) بھی اس سے محفوظ نہ رہے۔ ہم نے عقائد کو ان سے مستعار لیا اور پھر انہیں اسلام کا جزو بنا کر اپنے لٹریچر میں شامل کر لیا۔ قرآن کریم نے واضح طور پر بتا دیا تھا کہ شیطان نے آدم کی بیوی (عورت) کو نہیں بہکایا تھا بلکہ آدم اور اس کی بیوی (مرد اور عورت) دونوں کو بہکایا تھا۔ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ ..... (۲/۳۶) "شیطان نے مرد اور عورت دونوں کو (هُمَا) بہکایا۔" (قصۂ آدم کی قرآنی تصریحات پر پرویزؒ صاحب کی کتاب "ابلیس و آدم" یا "مطالب الفرقان" جلد دوم میں ملیں گی)۔

(۰)

عورت کی پیدائش

عیسائیت کا عقیدہ یہ ہے کہ پہلے آدم کو پیدا کیا گیا اور جب اس نے تنہائی محسوس کی تو پھر اس کی پسلی سے اس کی بیوی نکالی گئی۔ آپ غور کیجئے کہ یہی تصور، خود ہمارے ہاں بھی کس طرح حقیقت تسلیم کر لیا گیا۔ تفسیر ابنِ کثیر کا شمار ہمارے ہاں کی مستند ترین تفاسیر میں ہوتا ہے۔ اس میں پیدائشِ آدم کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ

> حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ ابلیس کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کا علم ظاہر کر کے پھر ان پر اونگھ ڈال دی گئی اور ان کی بائیں پسلی سے حضرت حوّا کو پیدا کیا۔ جب آنکھ کھول کر حضرت آدم نے انہیں دیکھا تو اپنے خون اور گوشت کی وجہ سے ان سے انس و محبت پیدا ہوئی۔ پھر پروردگار نے انہیں ان کے نکاح میں دیا اور جنّت میں رہائش کا حکم عطا ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کے جنّت میں داخل ہو جانے کے بعد حضرت حوّا پیدا کی گئیں۔ حضرت ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ وغیرہ صحابہؓ سے مروی ہے کہ ابلیس کو جنّت سے نکالنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو جنّت میں جگہ

---

[1] اِن امور کی تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب:۔
"WOMAN IN ANTIQUITY BY CHARLES SELTMAN."

دی گئی لیکن تن تنہا تھے۔ اس وجہ سے ان کی نیند میں حضرت حوّا کو ان کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ جاگ کر انہیں دیکھ کر پوچھنے لگے کہ تم کون ہو، کیوں پیدا کی گئی ہو؟ حضرت حوّا نے فرمایا کہ میں ایک عورت ہوں اور آپ کے ساتھ رہنے اور تسکین کے لئے پیدا کی گئی ہوں[1]

دوسری جگہ ہے کہ

صحیح حدیث میں ہے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور سب سے بلند پسلی سب سے زیادہ ٹیڑھی ہے۔ پس تو اگر اسے سیدھی کرنے کی کوشش کرے گا تو اسے توڑ دے گا اور اگر اس میں کچھ کجی باقی چھوڑتے ہوئے فائدہ اٹھانا چاہے گا تو بے شک فائدہ اٹھا سکتا ہے[2]

اس تفسیر اور روایات کی رُو سے (جن کے متعلق بدقسمتی سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں، حالانکہ ان کے وضعی ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا)، ایک تو یہ ثابت ہے کہ عورت کا وجود مقصود بالذات نہیں۔ وہ مرد کی تسکین کا ذریعہ ہے اور دوسرے یہ کہ چونکہ وہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے، اس لئے وہ سیدھی ہو ہی نہیں سکتی۔ جو شخص اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا وہ اسے توڑ دے گا۔ یعنی یہ ٹوٹتے ٹوٹ جائے گی لیکن سیدھی نہیں ہو گی۔

اس کے بعد آپ دیکھئے کہ اس "ٹیڑھی پسلی" کو سیدھا کرنے کے لئے کس قسم کی (وضعی) روایات حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی حیثیت سے ہمارے ہاں راہ پا گئیں اور ہماری تفسیروں کا حصہ بن گئیں سورۃ النساء میں ایک آیت ہے: اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ..... (۴/۳۴)۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "مرد عورتوں پر حاکم یا داروغہ ہیں"[3] اس ترجمہ کا مدار ان روایات پر ہے جو اس ضمن میں ہمارے ہاں متداول ہیں۔ تفسیر ابنِ کثیر (سورۃ النساء، پارہ پنجم) میں ہے کہ

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ عورتوں کو مردوں کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک عورت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے خاوند

---

[1] ترجمہ اُردو مولانا محمد جوناگڑھی۔ پارہ اوّل، صـ۸۵

[2] " " " " " " پارہ چہارم، صـ۶۶

[3] اس کا مفہوم ذرا آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔

کی شکایت کی کہ اس نے اسے تھپڑ مارا ہے۔ پس آپؐ نے اسے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا جو یہ آیت اتری اور بدلہ نہ دلوایا گیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک انصاری اپنی بیوی صاحبہ کو لئے ہوئے حاضر خدمت ہوئے۔ اس عورت نے حضورؐ سے کہا کہ یا رسول اللہ میرے اس خاوند نے مجھے تھپڑ مارا جس کا نشان اب تک میرے چہرے پر موجود ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ اسے حق نہ تھا۔ وہیں یہ آیت اُتری کہ ادب سکھانے کے لئے مرد عورتوں پر حاکم ہیں، تو آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اور چاہا تھا اللہ نے اور چاہا (ص۲)۔ اردنا امرًا وّ اراد اللہ غیرہٗ۔ (تفسیر المنار، مفتی محمد عبدہٗ، جلد ۵، ص۷۲)

آگے بڑھنے سے پیشتر، ذرا دل تھام کر سوچیئے کہ اس فقرہ کی زد کہاں جا کر پڑتی ہے۔ یعنی (اس روایت کی رو سے) حضورؐ نے فرمایا یہ کہ میں تو چاہتا تھا کہ عورتوں کو بدلہ لینے کا حق مل جائے لیکن جب خدا ہی نہ چاہے تو میں کیا کروں[1] (معاذاللہ ثم معاذاللہ)۔ اسی تفسیر میں آگے چل کر لکھا گیا ہے کہ

> ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ لونڈیوں[2] کو مارو نہیں۔ اس کے بعد ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ آئے اور عرض کرنے لگے یا رسولؐ اللہ! عورتیں آپؐ کے اس حکم کو سُنکر اپنے مردوں پر دلیر ہوگئی ہیں۔ اس پر حضورؐ نے انہیں مارنے کی اجازت دیدی۔ اب مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑ مار پیٹ شروع ہوئی اور بہت سی عورتیں شکایتیں لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو آپؐ نے لوگوں سے فرمایا کہ سنو! میرے پاس عورتوں کی فریاد پہنچی ہے۔ یاد رکھو! تم میں سے جو اپنی عورتوں کو زدوکوب کرتے ہیں وہ اچھے آدمی نہیں۔
>
> حضرت اشعثؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت فاروق اعظم کا مہمان ہوا۔ اتفاقاً اس روز میاں بیوی میں کچھ ناچاقی ہوگئی اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی صاحبہ کو مارا۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے۔ اشعثؓ! تین باتیں یاد رکھ جو میں نے آنحضرت سے سُنکر

---

[1] ان حضرات کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ حضورؐ کا ہر قول، وحیِ خداوندی پر مبنی ہوتا تھا۔ وہ ذرا سوچیں کہ اس عقیدہ کی رُو سے اس ارشادِ نبویؐ کا کیا مفہوم کا کیا ہے کہ ہم نے کچھ اور چاہا تھا اور خدا نے اس کے خلاف حکم دے دیا۔

[2] بات بیویوں کی ہو رہی ہے۔ کیا انہی کو "لونڈیاں" کہہ کر پکارا گیا ہے۔

یاد رکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرد سے یہ نہ پوچھا جائے کہ اس نے اپنی عورت کو کس بنا پر مارا ہے، دوسری یہ کہ وتر پڑھے بغیر سونا مت اور تیسری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی۔ (صفحہ ۲۱ — ۲۰)

اس تفسیر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ

رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ ماسوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ بخاری شریف میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ انکار کر دے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔ صحیح مسلم میں ہے کہ جس رات کوئی عورت بغیر روٹھنے کے اپنے خاوند کے بستر کو چھوڑے رہے تو صبح تک اللہ تعالیٰ کی رحمت کے فرشتے اس پر لعنتیں کرتے رہتے ہیں۔ (ص ۲۱)

یہ تو ہمارے ہاں کے مروجہ مذہب کی رُو سے عورت کی حیثیت ہے مردوں کے مقابلہ میں۔ جہاں تک عورتوں کے گناہوں اور برائیوں کے سرچشمہ ہونے کا تعلق ہے اس سے بھی ہماری کتبِ روایات بھری پڑی ہیں۔ مثلاً احادیث کی صحیح ترین کتاب بخاری شریف میں کہا گیا ہے کہ

حضرت ابوہریرہؓ مروی ہیں کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت کبھی نہ سڑتا اور اگر حوّا نہ ہوتیں تو کوئی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی۔ (بخاری۔ کتاب پیدائش انبیاء)۔

دوسری روایت میں ہے:۔

حضورؐ نے فرمایا کہ میرے پیچھے مردوں پر کوئی فتنہ عورتوں سے زیادہ باعثِ مضرت نہیں۔

(بخاری۔ کتاب النکاح)

ایک اور روایت میں ہے کہ

حضورؐ نے فرمایا کہ نحوست تین چیزوں میں ہے، عورت، گھر، گھوڑا۔ (بخاری۔ کتاب النکاح)

اسی سلسلہ میں ایک اور روایت ہے کہ

حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے جنت میں دیکھا تو وہاں اکثریت فقیروں کی پائی گئی اور دوزخ

میں دیکھا تو اکثریت عورتوں کی نظر آئی۔" (بخاری۔ کتاب الانبیاء)۔

صاف نظر آرہا ہے کہ اس مقصد کے پیشِ نظر کہ مسلمان اس پر اعتراض نہ کر سکیں کہ بائبل میں یا عیسائیت کے

یہ روایات وضعی ہیں

عقائد کی رو سے عورت کو کس قدر قابلِ نفرت ٹھہرایا گیا ہے، یہودیوں اور عیسائیوں نے خاص سازش کے تحت اس قسم کی روایات وضع کیں اور انہیں ہماری کتب احادیث میں داخل کر دیا۔ انہوں نے تو ایسا ہی کیا تھا لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ان وضعی روایات کو احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرار دے کر سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ اس قسم کی حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کس طرح صحیح قرار پا سکتی ہے۔ یہی نہیں کہ خود نہیں سوچتے، جو "سوختہ بخت" یہ کہہ دے کہ ایسی روایات کی نسبت، حضور نبی اکرمؐ کی طرف صحیح معلوم نہیں ہوتی، اسے "منکرِ حدیث" قرار دے کر دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتے ہیں۔

دوسرا حصہ "عورت قرآن کے آئینے میں" اگلے شمارہ میں ملاحظہ فرمائیے۔ (ادارہ)

ایک طرف کہا جاتا ہے کہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ "جنت، ماں کے قدموں کے نیچے ہے" اور دوسری طرف بتایا جاتا ہے کہ حضورؐ نے جہنم میں عورتوں کی اکثریت دیکھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ عورتیں دنیا میں "مائیں" نہیں تھیں؟ اگر مائیں تھیں ــــ اگر سب کی سب نہیں تو ان میں سے بیشتر مائیں ہوں گی ــــ تو پھر اس کا کیا جواب کہ ان کے پاؤں کے نیچے تو جنت تھی لیکن وہ خود جہنم میں تھیں! صاف نظر آتا ہے کہ ایسی وضعی روایات پیش کرنے والے جب عورت کے متعلق بات کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں "بیوی ہوتی ہے" عورت کی اور کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

تعلیم و تربیت

برائے اہلِ لاہور

کلاس '2' سے میٹرک، سائنس اور آرٹس (انگلش میڈیم) ایف ایس سی (پری انجینئرنگ)

کامرس کے مضامین گھر پر پڑھانے کے لئے بہترین اساتذہ کی خدمات حاصل کریں۔

رابطہ: مینیجر طلوعِ اسلام ٹرسٹ۔ فون نمبرز: ۸۷۹۲۴۶، ۸۷۶۲۱۹

حقائق و عبر

بیچارے مولانا سمیع الحق صاحب

مولانا سمیع الحق صاحب کی ادارت میں اکوڑہ (سرحد) سے ایک ماہنامہ 'الحق' شائع ہوتا ہے۔ سرِ ورق پر نمایاں طور سے لکھا ہے "علمی و دینی مجلہ"۔ یہ مجلہ کس قسم کا دین پیش کرتا ہے ملاحظہ ہو۔

فرماتے ہیں۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے غزوہ خیبر کے موقعہ پر عورتوں سے متعہ اور اہلی (گھریلو) گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔

(الحق، جون۔ جولائی ۱۹۹۴ء)

مولانا نے اس موضوع پر ہر دو پرچوں میں پندرہ صفحے سیاہ کئے ہیں۔ اسے کہتے ہیں، دیلی جٹی اون دیلے۔ مولانا فرماتے ہیں گدھوں کے دو اقسام ہوتے ہیں۔ (۱) حمر الاہلی (خانگی۔ گھریلو گدھا) اسے حمر انسیہ، یہ انس سے ماخوذ ہے۔ انس الفت اور محبت کو کہتے ہیں۔ یہ ضد الوحش ہے۔ یعنی وہ جانور جو انسان کا کنٹرول قبول نہیں کرتے ــ تو احمر الاہلی کا گوشت کھانا منع ہے۔

(۲) حمر الوحشی (وحشی گدھے) یہ حرام نہیں ہیں ان کا گوشت کھانا جائز ہے، یہ جنگلوں اور دشت و بیاباں میں رہتے ہیں۔ انہیں انسانوں سے وحشت ہے۔ لہٰذا، وحشی کہلاتے ہیں ــ اور متعہ کے تین اقسام ہیں۔ پہلا متعہ النکاح، دوسرا متعہ الطلاق، تیسرا متعہ الحج۔ متعہ ایک چیز سے نفع حاصل کرنا ہے۔ جمہور کا بالاتفاق یہی مسلک ہے کہ لحوم حمر اہلیہ مکروہ تحریمی ہے۔

طلوعِ اسلام

مولانا اتنی تندی سے متعہ سے گدھے اور گدھے سے متعہ پر آتے ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ آخر متعہ اور گدھا خوری میں مماثلت کیا ہے؟ آخر وطنِ عزیز میں متعہ اور گدھا خوری کی کیا ضرورت پڑ گئی؟

دیگر یہ کہ حِمَارُ الوَحشی کا گھریلو یا غیر گھریلو گدھے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ZEBRA (گورخر) کو کہتے ہیں

جس پر کالی اور سفید لکیریں ہوتی ہیں (ایک جھنڈے کی طرح)۔ یہ انسیت، الفت اور محبت کی بھی خوب رہی۔
• یعنی گھریلو گدھا (حمر اہلی) کا گوشت کھانا اس وجہ سے منع ہے کہ اس کے ساتھ اہلِ خانہ محبت، الفت اور انسیت رکھتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو بھینس، گائے، بھیڑ بکری اور مرغی مرغا سے لوگ زیادہ انسیت رکھتے ہیں۔ ان کا گوشت کیوں حلال قرار پایا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۶/۴۳) اور شیطان ان کے لئے وہ عمل مزین کر دیتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔

انسانیت کی فلاح و بہبود، آخرت کی کامرانیاں، جنت کی نعمتیں اور عیش سامانیاں اُسے اسی عمل میں نظر آتی ہیں۔ يَاسَاتِرُ الرَّبِّ۔

مولانا نے پچھلے دنوں سینٹ میں ناموسِ صحابہؓ کا ترمیمی بل پیش کیا جسے حکومت اور اپوزیشن نے متفقہ طور پر مسترد کیا۔ روزنامہ جنگ، ۲۵ جولائی کے مطابق مولانا یہ کہہ کر چل دیئے کہ حکومت اور اپوزیشن نے سینٹ کا مُنہ کالا کر دیا۔ پتہ نہیں مولانا نے سینٹر کا کہا یا سینٹ کا، اخبار والے غلطیاں بھی تو بہت کرتے ہیں۔

•:•

مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کا ترجمان، مجلہ ہفت روزہ "اہل حدیث" (اربابِ حکومت کیوں خاموش) کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی باقاعدہ نبوت کے مدعی ہیں تو ان کا اور ان کے ماننے والوں کا مسلمانوں سے کیا تعلق ہے۔ یہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ یہ یکسر گمراہ فرقہ ہے۔

طلوعِ اسلام

بہ یک قلم گمراہ بھی اور فرقہ بھی! گذارش ہے کہ قادیانیوں کو خارج از اسلام قرار دینے کے بعد یہ مسلمانوں کا فرقہ نہ رہا۔ فرقے تو اسلامیان نے بنا رکھے ہیں، جیسے شیعہ سنی اور سنیوں میں وہابی دیوبندی فرقہ، بریلوی فرقہ اہل حدیث، اہلِ قرآن اور مرکزی جمعیت اہل حدیث اور متحدہ جمعیت اہلحدیث وغیرہ ــــ جو حضرات اب بھی قادیانیوں کو فرقہ لکھتے ہیں وہ گویا انہیں واپس اسلام میں داخل کر رہے ہیں!

یاد رہے کہ فرقہ بندی کو اللہ تعالیٰ نے شرک کہا ہے اور اپنے رسول صلعم کی زبان سے کہلوایا ہے کہ تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور فرقے بن گئے (۳۲ ـ ۳۰/۳۱)؛ (۶/۱۶۰)؛ (۳/۱۰۴)۔

وہ ایضاً لکھتے ہیں۔ کاش علماء منڈی کا مال نہ بنتے۔ ابن الوقت کے بجائے ابوالوقت کا کردار ادا کرتے۔

اس باب میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی رائے ہماری رائے اور غالب کے اس مصرعے پر اکتفا کریں گے کہ

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

جہادِ اکبر

ٹی وی اور بکری۔ مجلہ الدعوہ، جولائی ۱۹۹۴ء۔

قارئین کرام! ٹی وی کے خلاف جہاد میں مجاہدین کا سکور اس ماہ ۱۰۹ تک پہنچ گیا۔ لکھتے ہیں چیچہ وطنی سے بھائی حافظ محمد امیر شاہ نے اطلاع دی ہے کہ ان کی بہن کی ایک سہیلی نے مجلہ الدعوہ سے متاثر ہو کر اپنے گھر کا ٹی وی چھریوں کے وار کر کے توڑ پھوڑ دیا۔ یہ بہن مجلہ الدعوہ بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتی تھی اور نئی اہلحدیث ہوئی ہے۔ یہ گھر میں بیٹھی مجلہ الدعوہ پڑھ رہی تھی کہ غیرتِ ایمانی کے جذبے سے مغلوب ہوگئی۔ وہ یہ سوچ کر حیران ہوئی کہ ٹی وی ہمیں کنجروں، میراثیوں اور بھانڈوں کے پروگرام دکھانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ بہن نے ٹی وی بدمعاش پر چاروں طرف سے چھریوں کے وار کر کے اسے بُری طرح چھلنی کر دیا۔ تاکہ بعد میں یہ بدمعاش فروخت ہو کر کسی اور بھائی کو بھی گمراہ کرنے کے کام نہ آسکے۔

باپ جب گھر آیا۔ بچی سے پوچھا کہ ٹی وی کس نے توڑا ہے، تو بچی نے ڈر کے مارے کہا کہ اس کو بکری نے توڑا ہے۔ باپ نے کہا بکری کو اس سے اتنا اختلاف تو نہ تھا۔ بعد میں لڑکی نے سارا واقعہ بتا دیا۔ باپ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ ان کی بچی پاکیزہ خیالات کی مالک ہے۔

طلوعِ اسلام

ٹی وی پر کنجروں، میراثیوں اور بھانڈوں کے علاوہ علماء کرام، دانشورانِ قوم، راہنما، وزراء، اطباء، مفکرین بھی آتے ہیں۔ تلاوت پڑھی جاتی ہے۔ نعتیں اور حمد سنائی جاتی ہے۔ پورے عالم کی خبریں سنائی جاتی ہیں۔ یعنی ٹی وی صرف بدمعاش نہیں۔ یہ بہ یک وقت عالم، دانشور و راہنما، نعت خواں اور قاری بھی ہے!

علامہ پرویز

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝ (۳۳/۵۶)

طلوعِ آفتاب

عُمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

حضرت اسمٰعیلؑ کے بارہ[۱۲] بیٹے تھے۔ ان میں سے دوسرا بیٹا (قیدار) نہایت نامور ہوا ہے۔ یہ حجاز میں آباد ہوا اور خدا کے اس پہلے گھر کی تولیت کا مقدس فریضہ اس کے حصہ میں آیا جو حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے ہاتھوں وجود پذیر ہوا تھا۔ بنو قیدار کی شاخ پھیلتے پھیلتے وسیع خاندانوں میں منقسم ہو گئی۔ ان میں قریش کا خاندان نہایت معزز اور ممتاز شمار کیا جاتا تھا۔

قریش کا مفہوم

قریش، فہر کا لقب تھا۔ عربی میں لفظ قریش کے متعدد معانی ہیں۔ دیل مچھلی کو بھی قریش کہتے ہیں، اس لئے اکثر قیاس کا رُخ اس طرف گیا ہے کہ فہر نے اپنی قوت اور عظمت کے اظہار کے لئے یہ لقب اختیار کیا تھا۔ قریش میں، قصیٰ ابن کلاب ایک خصوصی شہرت کا مالک ہے۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے اس قبیلہ میں ایک سیاسی نظام قائم کیا۔ اس نے ایک طرف کعبہ کے انتظام کو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا۔ مثلاً سقایہ (حجاج کے کھانے پینے کا انتظام) عمارہ (خانہ کعبہ کی دیکھ بھال)، رفادہ (حاجیوں کی مالی اعانت کا انتظام) وغیرہ۔ اور دوسری طرف سیاسی امور کی سرانجام دہی کے لئے، ندوہ (عدالت گاہ) اور مشورہ (مشاورت گاہ) جیسے شعبے قائم کئے۔ دارالندوہ کو قریش کا ایوانِ حکومت سمجھئے جہاں ان کے اربابِ بست وکشاد ہر قسم کے اجتماعی امور کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ قصیٰ ابن کلاب کے بعد، قریش میں ہاشم کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ یہ بھی بڑا نامور سردار تھا جس نے تولیتِ کعبہ کے سلسلہ میں اپنے فرائض کو نہایت حسن وخوبی سے سرانجام دیا۔ اس نے قیصرِ روم اور حبش کے بادشاہ نجاشی سے فرامین حاصل کئے کہ تجارِ قریش کے قافلے جب ان کے حدودِ سلطنت میں داخل ہوں تو ان سے کوئی ٹیکس وصول نہ کیا جائے۔ اس کا بیٹا عبدالمطلب

بھی اپنے قبیلہ کا نامور سردار تھا۔ ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے چاہ زمزم کا (جو ایک مدت سے اَٹ کر گم ہو چکا تھا) سراغ لگایا اور کھدوا کر اسے نئے سرے سے آباد کیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے عبداللہ کی شادی قبیلۂ زہرہ میں وہب بن عبد مناف کی صاحبزادی آمنہ سے کی جو قریش کے گھرانے میں ممتاز تھیں۔

آفتابِ عالمتاب

اسی مکرم و ممتاز گھرانے میں، موسمِ بہار میں، دوشنبہ کے روز، بتاریخ ۹ ربیع الاوّل مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء، بوقت صبح، اس نیّرِ عالمتاب کا طلوع ہوا جس سے دنیا بھر کی تاریکیوں کو کافور ہو جانا تھا۔ دادا نے اپنے مرحوم[1] لختِ جگر کی یادگار کو اپنی گود میں لیا اور خانۂ کعبہ میں جا کر دعا مانگی۔ ساتویں دن تمام قبیلہ کی دعوت کی اور بچّہ کا نام محمدؐ رکھا۔ لوگوں نے ازراہِ استعجاب پوچھا کہ آپ نے اپنے خاندان کے مروّجہ ناموں کو چھوڑ کر یہ نام کیوں رکھا۔ کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرا بچّہ دنیا بھر کی ستائش اور تعریف کا شایاں قرار پائے۔ یہ اسمِ گرامی دادا کی طرف سے تجویز ہوا۔ لیکن والدہ نے احمدؐ[2] نام رکھا۔ اس زمانہ میں دستور تھا کہ شرفائے عرب اپنے بچّوں کو صحرانشین بدّوؤں کے ہاں بھیج دیتے تھے تاکہ ان کی ابتدائی پرورش اور تربیت کھلی فضا میں ہو اور ان میں فصاحت کا جوہر پیدا ہو جائے جو عربوں کی بہت بڑی خصوصیت تھی۔ اس دستور کے مطابق حضورؐ کی ابتدائی پرورش بنی سعد کے قبیلہ میں ہوئی جو فصاحت و بلاغت میں مشہور تھا، دایۂ فطرت کی گود میں ہوئی۔ قریب چھ برس کی عمر تھی کہ حضورؐ کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا اور آپؐ کی کفالت آپؐ کے دادا نے اپنے ذمّہ لے لی۔ کتبِ آثار و روایات میں حضورؐ کے زمانہ پیش از نبوّت کی سیرتِ طیبہ کے احوال و کوائف بھی تفصیل سے مذکور ہیں (اور حقیقت یہ ہے کہ، جیسا کہ غیر مسلموں تک کو اعتراف ہے، یہ خصوصیت بھی نبیٔ اکرمؐ ہی کو حاصل

---

[1] حضورؐ کے والد ماجد کا انتقال حضورؐ کی پیدائش سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ حضورؐ کی یتیمی کا ذکر قرآنِ کریم میں بھی ہے۔ اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۝ (۹۳/۶) کیا خدا نے تمہیں یتیم پا کر پناہ نہیں دی؟ [2] قرآنِ کریم نے حضورؐ کے اسمِ گرامی محمدؐ کا بھی ذکر کیا ہے اور بشارتِ حضرت عیسیٰؑ کے سلسلہ میں احمدؐ کا بھی۔ (دیکھئے ۳/۱۴۳؛ ۳۳/۴۰؛ ۶۱/۶؛ ۴۸/۲۹ اور احمدؐ کے لئے ۶۱/۶)۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اِنَّ لِیْ اَسْمَآءً اَنَا مُحَمَّدٌ وَ اَنَا اَحْمَدُ..... الخ۔ طبقات ابنِ سعد میں بھی حضورؐ کے اسمِ گرامی احمدؐ کے متعلق بہت سی روایات مندرج ہیں۔ نیز حضرت حسان بن ثابتؓ اور حضرت کعب بن مالکؓ نے جو حضورؐ کی مدح و ستائش میں قصائد لکھا کرتے تھے۔ اپنے اشعار میں متعدد جگہ حضورؐ کو اسمِ احمدؐ سے مخاطب کیا ہے۔

زمانہ قبل از نبوّت

ہے کہ آپؐ کے سوانح حیات کی جزئیات تک تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم کا مقصد چونکہ اس تعلیم کو پیش کرنا ہے جو حضورؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی اور جس سے عالمِ انسانیت میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہوا اس لئے وہ حضورؐ کے عہدِ رسالت کی زندگی ہی کو بہ تفصیل پیش کرتا ہے۔ زمانۂ قبل از رسالت کی زندگی کے متعلق وہ صرف ایک شہادت پر اکتفا کرتا ہے اور وہ شہادت ایسی عظیم القدر اور جامع ہے کہ اس میں حضورؐ کی پوری کی پوری حیاتِ مقدسہ اس طرح سمٹ کر آگئی ہے جیسے آنکھ کے تل میں آسمان (اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا)۔ حضور نبی اکرمؐ کی پیدائش اور پرورش اس ماحول میں ہوئی جہاں شرک اور بت پرستی کا مسلک عام تھا۔ جس کعبہ میں عبدالمطلب اپنے چہیتے پوتے کو دعاء کے لئے لے گئے اس کے گرد و پیش سینکڑوں بُت نصب تھے اور آپؐ کا خاندان اس بُت کدہ کا کلید بردار تھا۔ اسی ماحول میں آپؐ کی ساری عمر بسر ہوئی۔ لیکن آپؐ نے مراسمِ شرک سے ہمیشہ اجتناب کیا۔ ایک دعوت میں آپؐ کے سامنے کھانے میں اس جانور کا گوشت آیا جو کسی بت کے نام پر ذبح کیا گیا تھا تو آپؐ نے اسے کھانے سے انکار کر دیا[1]۔ مراسمِ شرک و کفر تو کجا، معاشرہ کی عام معیوب باتیں، جن کا عربوں میں بے محابا رواج تھا حضورؐ کے حسنِ سیرت کو آلودہ نہ کر سکیں۔ مثلاً عربوں کی نگہ جہالت آمیز، ننگے ہو جانے میں کوئی عیب نہیں دیکھتی تھی۔ حتیٰ کہ مرد اور عورتیں طوافِ کعبہ کے وقت اپنے کپڑے اتار دیتے تھے۔ حضورؐ کا بچپن بھی اسی مسموم سوسائٹی میں سانس لے رہا تھا، لیکن کیفیت یہ تھی کہ ایک دفعہ خانۂ کعبہ کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ آپؐ اینٹیں اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے جس سے کندھے پر رگڑ لگ رہی تھی۔ آپؐ کے چچا (حضرت عباسؓ) نے آپؐ کا تہبند کھول کر کندھے پر رکھ دیا کہ اس کے اوپر اینٹیں رکھی جائیں۔ لیکن ننگے ہونے کے احساس سے آپؐ پر بے ہوشی کی سی حالت طاری ہو گئی اور ہوش آنے پر آپؐ کی زبان پر تھا۔ میرا تہبند۔ حضرت عباسؓ نے فوراً تہبند باندھ دیا[2]۔ یہی بچپن جب جوانی میں پہنچا ہے تو شرم و حیا کی کیفیت یہ تھی کہ (بقول صحابہ کرامؓ) كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَشَدَّ حَيَاءً مِنَ الْعَذْرَاءِ فِي خِدْرِهَا[3] (حضور پردہ نشین کنواری لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے تھے)۔

ناحق خونریزی سے اجتناب

عربوں کی سفاکی اور خون آشامی کی داستانیں گذشتہ اوراق میں ہماری نظروں سے گزر چکی ہیں۔ لیکن ان سب میں ایک

---

[1] بخاری باب المناقب۔ [2] بخاری کتاب الحج۔ [3] بخاری کتاب الادب۔

دامن ایسا بھی تھا جسے خونِ ناحق کے ایک قطرہ نے بھی داغدار نہیں کیا۔ یہ دامن، امن وسلامتی کے شاہزادے کے سوا اور کس کا ہو سکتا تھا؟ قبیلوں کی ان لڑائیوں میں حضورؐ کی عدم شرکت بزدلی کی بناء پر نہیں تھی بلکہ اس لئے کہ یہ لڑائیاں عصبیتِ جاہلیہ کی باطل بنیادوں پر اٹھتی تھیں۔ اس تمام عمر میں حضورؐ نے صرف ایک لڑائی میں شرکت کی جو قریش اور قبیلہ قیس میں ہوئی تھی اور جس میں قریش برسرِ حق تھے لیکن چونکہ یہ لڑائی بھی ایام الحرام میں پیش آئی تھی اس لئے حضورؐ نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا[1]۔ اس لڑائی میں حضورؐ کی شرکت بھی ایک طرح، صلح وآشتی کا موجب بن گئی۔ اس لئے کہ لڑائی سے واپسی پر بعض طبائع میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی جن میں پیش پیش حضورؐ کے اہلِ خاندان تھے۔ چنانچہ انہوں نے باہمی معاہدہ کیا کہ ان میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا اور کوئی ظالم مکہ میں نہیں رہنے پائے گا[2]۔ حضورؐ اس معاہدہ میں شریک تھے اور عہدِ نبوت میں بھی اس کا تذکرہ فخر ومسرت سے فرمایا کرتے تھے۔ بات تھی بھی فخر ومباہات کی کہ عربوں کی متشدد قبائلی عصبیت کے پیشِ نظر "مظلوم کی حمایت" کا عہد (خواہ مظلوم کوئی ہو) ایک بہت بڑی اصطلاح تھی۔ اس معاہدہ کو حلف الفضول کہتے ہیں۔ اگرچہ عربوں کے خوئے انتقام اور عصبیتِ جاہلیہ نے بعد میں اس معاہدہ کو کالعدم قرار دے دیا جب خود حضورؐ کی مخالفت میں ظالم ومظلوم کا امتیاز بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ بایں ہمہ یہ اصلاح کی ایک مستحسن کوشش ضرور تھی یہ معاہدہ ناکام اس لئے رہا کہ اس کا وجود ایک ہنگامی جذبہ کا رہینِ منت تھا۔ ان لوگوں کی اصلاح نہیں ہوئی تھی جن سے یہ بروئے کار آیا تھا۔ یہ اصلاحِ نفوس، تعلیم وتربیتِ رسالت سے ہی ممکن تھی جس کے لئے زمانہ کو کچھ وقت اور انتظار کرنا تھا۔

امن وسلامتی کا پیامبر

حضورؐ کے حسنِ تدبر سے کس طرح قریش کی خون آشام تلواریں جو ذرا ذرا سی بات پر برقِ خاطف بن کر فضا میں چمک اٹھتی تھیں پھر سے زیرِ نیام ہو جاتی تھیں، اس کی مثال وہ یادگار واقعہ ہے جو تعمیرِ کعبہ کے سلسلہ میں پیش آیا۔ کعبہ کی عمارت قدِ آدم اونچی تھی اور نشیب میں واقع ہوئی تھی اس لئے بارش کا پانی اسے نقصان پہنچایا کرتا تھا۔ قریش نے فیصلہ کیا کہ اسے از سرِ نو مستحکم طور پر تعمیر کر دیا جائے۔ چونکہ تعمیرِ حرم کا کام وجہِ عز وشرف سمجھا جاتا تھا اس لئے اس میں مختلف قبائل شریک ہوئے اور ہر قبیلہ نے ایک حصہ اپنے لئے مختص کر لیا۔ لیکن جب حجرِ اسود نصب کرنے کا وقت آیا تو سب میں جھگڑا پیدا ہوا۔ چنانچہ آن کی آن میں تلواریں بے نیام ہو گئیں۔ سردارانِ قبائل نے

---

[1] ابن ہشام [2] طبقات ابن سعد، جلد اوّل۔

خون سے لبریز پیالوں میں اپنی انگلیاں ڈبو لیں کہ یہ جان دینے کی قسم کے مرادف تھا۔ یہ جھگڑا چار دن تک برابر جاری رہا۔ پانچویں دن یہ طے پایا کہ دوسری صبح جو شخص سب سے پہلے آئے وہی ثالث تسلیم کر لیا جائے۔ دوسری صبح سب سے پہلے وہاں وہی ذاتِ گرامی موجود تھی جس کے ذمہ دنیا بھر کے تنازعات اور اختلافات مٹانے کا اہم فریضہ عائد ہونے والا تھا۔ آپؐ نے حجرِ اسود اپنی چادر میں رکھا اور تمام دعویدار قبائل کے نمایندگان سے کہا کہ وہ اس چادر کو اوپر اٹھائیں۔ جب چادر موقعہ کے برابر آ گئی تو آپؐ نے حجرِ اسود اٹھا کر نصب کر دیا اور یوں ایک خونریز جنگ کو ہوتے ہوتے روک دیا۔ (پرویزؒ صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب 'معراجِ انسانیت' سے ماخوذ)

ہمارا یہ دعویٰ ہے (اور مبنی بر ایمان دعویٰ) کہ اسلام، نوعِ انسان کی جملہ مشکلات کا حل پیش کرتا ہے لیکن جب یہ پوچھا جائے کہ اسلام ہے کیا؟ تو مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں اٹھتی ہیں جن کا ماحصل، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور نکاح و طلاق کے مسائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام یہی ہے تو اس سے زندگی کے مسائل کا حل تو نہیں مل سکتا۔

اسلام ایک نظامِ حیات ہے جس کی بنیادیں چند غیر متبادل تصورات پر قائم ہیں جب تک یہ تصورات واضح طور پر سامنے نہ آئیں، اسلام بہ حیثیت ایک نظامِ حیات کے سمجھ میں نہیں آ سکتا ــــ ضرورت تھی کہ ان تصورات کو واضح، دل کش انداز اور عصرِ حاضر کے علوم کی روشنی میں یکجا پیش کیا جائے ــــ علامہ پرویزؒ کی کتاب

"اسلام کیا ہے"

اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اگرچہ اس کی پہلے بھی ضرورت تھی لیکن اب جبکہ اسلام، اسلام کا چرچا عام ہو رہا ہے لیکن کوئی نہیں بتاتا کہ اسلام ہے کیا، اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

یہ کتاب ہمارے مذہب گزیدہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ میں آ جائے تو انہیں علیٰ وجہ البصیرت اسلام کا گرویدہ بنا دے اور اگر غیر مسلموں کے ہاتھ میں دیدی جائے تو اسلام کے متعلق ان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں ــــ قیمت (علاوہ ڈاک پیکنگ خرچ) اعلیٰ ایڈیشن ۱۰۰/- سٹوڈنٹ ایڈیشن ۵۰/- روپے۔

مینیجر طلوعِ اسلام ٹرسٹ

قمر پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام میں سیاسی پارٹیوں اور مذہبی فرقوں کا وجود

انسان نے جب سے مل جل کر رہنا سیکھا ہے۔ تب سے نظامِ سیاست کے تصوّر کی ابتداء ہوئی ہے۔ اس نظام کی ضرورت تھی، آپس کے جھگڑے، ٹکراؤ اور باہمی تنازعات کو ختم کرنا اور ایسی تدابیر کرنا کہ یہ آپس کے ٹکراؤ پیدا ہی نہ ہوں۔ اب جن لوگوں نے یہ جھگڑے ہٹانے اور فیصلے کرانے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ دوسروں سے اپنا حکم منوانے میں بڑی لذّت ملتی ہے۔ اس لئے انہوں نے ایسی تدابیر سوچنی شروع کیں جن سے ان کے ہاتھ میں آیا ہوا اقتدار چھننے نہ پائے۔ اس طرح معاشرہ میں دو گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک وہ جو دوسروں سے اپنا حکم منواتا تھا اور دوسرا وہ جو ان کا حکم مانتا تھا۔ یہ حکمران طبقہ شروع سے آج تک ایک ہی نظریہ پر کاربند ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اسلوب و انداز اور اسباب و ذرائع میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن اصول ہر جگہ یہی کارفرما ہے۔ انسان کے عہدِ جہالت و بربریّت میں بھی یہی ہوتا تھا اور آج بھی اس زمانۂ تہذیب و تمدّن میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔

اسلامی نظام کا پہلا اور بنیادی اصول یہ ہے کہ "ہم نے تمام فرزندانِ آدم یعنی انسان کو یکساں طور پر واجب التکریم بنایا ہے"۔ یہ قرآن کا انقلابی اعلان ہے: (۱۷ : ۷۰)

اسلامی نظام کا دوسرا بنیادی اصول اور تصوّر یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسروں کو یعنی اپنے جیسے انسانوں کو اپنا محکوم بنائے۔ (۲۸ : ۴)۔ فرعون نے قومِ بنی اسرائیل کو اپنا محکوم بنا رکھا تھا۔ اور انہیں طرح طرح کے عذاب دیتا تھا۔ اس ڈر سے کہ وہ کہیں ایک مرکز پر جمع ہو کر اس کے لئے خطرہ کا موجب نہ بن جائیں۔ وہ کرتا صرف یہ تھا کہ "ان میں پارٹیاں بناتا رہتا تھا اور اس طرح انہیں آپس میں لڑا کر ان کی قوّت کو کمزور کرتا رہتا تھا۔ (۲۸ : ۴)

قرآن کریم نوعِ انسانی کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے ایک ماننے والے اور ایک نہ ماننے والے یعنی کافر جو حقیقت پر پردہ ڈالتے اور دوسرے وہ جو مومنین ٹھہرے پوری انسانیت کیلئے نفع بخش کام کرنے والے تمام کے تمام مومنین کو ایک گروہ قرار دیا ہے جس میں کسی قسم کی تفریق و تقسیم کا شائبہ تک نہیں۔

جو لوگ رسالتِ محمدیہ پر ایمان لا کر حلقۂ مومنین میں داخل ہوئے، انہیں قرآن کریم نے "ایک امّت" کہا

ہے۔ سورۃ بقرہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اور اس طرح کیا ہم نے تم کو امتِ معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور رسول تم پر گواہی دینے والا" (۲/۱۴۳)

اس امّتِ واحدہ کو تاکید کی گئی ہے کہ "تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور باہمی تفرقہ نہ پیدا کرو۔ (۳ : ۱۰۳) یہاں اللہ کی رسّی کتاب اللہ ہے جسے تھامنے کی ساری امّت کو تاکید کی گئی ہے اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالنے کو کہا گیا ہے۔ اب اگر قوم فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ جائے۔ یا پھر پارٹیاں بنا دی جائیں تو تفرقہ تو ہو گیا۔ تفرقہ سے باہمی عداوت پیدا ہوتی ہے۔ یہ راستہ ہوتا ہے جہنم کا۔ اگر امّت میں یہ تفرقہ نہ ہو اور وہ امّتِ واحدہ ہو تو یہ خدا کی نعمت ہوتی ہے۔ ایک ملک میں بسنے والے افراد، ایک قوم اسی صورت میں بنتے ہیں جب وہ ایک ضابطۂ قوانین کی اطاعت کریں۔ قوم کی وحدت کا انحصار قانون کی وحدت پر ہوتا ہے۔ اگر کسی قوم کے مختلف گروہ یا پارٹیاں مختلف قوانین کے تابع اپنی اپنی زندگی بسر کریں تو ان میں کبھی وحدت نہیں پیدا ہو سکتی۔

امّتِ مسلمہ بھی امّتِ واحدہ اسی صورت میں بن سکتی ہے جب وہ ایک ضابطۂ قوانین کے تابع رہے اور چونکہ تمام مسلمانوں کے لئے ایک ہی ضابطۂ قوانین یعنی قرآن کی اطاعت لازمی قرار دی گئی ہے۔ اس لئے ان میں تفرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ خدائے واحد کی طرف لے جانے والا راستہ ایک ہی ہے۔ اسی راستہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم گامزن رہے اور اسی راستہ پر چلنے کی تاکید کرتے رہے۔ دوسری طرف فرقہ بندی میں ہر گروہ اور ہر فرقہ الگ الگ راستہ اختیار کرتا ہے جسے وہ ٹھیک تسلیم کرتا ہے اور عین اسلام سمجھ کر اس کی پیروی کرتا ہے اور یوں وہ خدا کی طرف جانے والے راستے سے بھٹک جاتا ہے۔ صراطِ مستقیم ایک ہی ہے متفرق راستے صراطِ مستقیم نہیں ہو سکتے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا سیاسی پارٹیاں بھی اسی زمرے میں آتی ہیں۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ اسلام میں "دین اور سیاست" کوئی دو الگ الگ چیزیں نہیں۔ اگر دین سے سیاست الگ کر دی جائے تو چنگیزی رہ جاتی ہے۔ اس سے یہ عیاں ہوا کہ اسلام میں دین اور سیاست میں DUALISM یعنی ثنویت نہیں ہے۔ پارٹی سازی حکمتِ فرعونی ہے۔ قرآن نے صاف اور واشگاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ "جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا اور پارٹیوں میں بٹ گئے اے رسولؐ تیرا ان سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں" (۶ : ۱۵۹) اس طرح جن لوگوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واسطہ نہ رہے وہ مسلمان نہیں ہو سکتے کیونکہ مسلمان کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور اس طرح وہ یعنی مسلمان امّتِ محمدیہ بنتے ہیں۔ خدا نے اسی لئے کہا ہے کہ "تمہارا نام مسلم رکھا ہے" (۲۲ : ۷۸)

جہاں فرقے ہوں وہاں ہر کوئی اپنی پہچان اپنے اپنے فرقہ کی رُو سے کراتا ہے اور فخر محسوس کرتا ہے کہ وہ سچّا ہے۔ نہ کہ مسلم۔

قرآنِ کریم کے نزدیک حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کا کوئی تصوّر نہیں۔ یہ ہمارا پیدا کردہ تصوّر ہے جو ہمیں مغربی جمہوریّت کی شکل میں ورثہ میں ملا ہے۔ قرآن کی رُو سے نہ کوئی واحد جماعت یا اختیار ہے اور نہ کوئی کثیر جماعتی نظام۔ احکامِ خداوندی کے نزدیک صرف دو ہی "حزب" ہیں۔ ایک کو قرآن نے "حزب الشیطٰن" اور دوسرے کو "حزب اللہ" کہا ہے (۵۸ : ۱۹)۔ حق غالب آکر رہتا ہے۔ کامیابی اور کامرانی "حزب اللہ" کے نصیب میں لکھ دی گئی ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ صحیح معنوں میں خدا کی جماعت ہو۔ صراطِ مستقیم پر چلنے والی جماعت۔

اب ہمیں یہ بھی دیکھنا اور پرکھنا ہوگا کہ آیا اکثریّت کے فیصلے درست ہوئے ہیں یا یوں کہہ لیں کہ اگر کسی مسئلہ میں اکثریّت ایک طرف ہو تو وہ حق بجانب یا اپنے مؤقف میں صحیح ہونگے۔ اس تصوّر کی قرآنِ کریم نے نفی کردی ہے اور غلط قرار دے دیا ہے۔ کسی مسلک کے صحیح ہونے کی یہ دلیل نہیں کہ اسے اکثریّت نے اختیار کر رکھا ہے۔ اگر یہ درست تسلیم کرلیا جائے اور اکثریّت کا اتّباع کرنا شروع کردیا جائے یہ سوچتے ہوئے کہ اکثریت ٹھیک ہوتی ہے تو یہ چیز ہمیں خدا کی راہ سے ہٹا کر گمراہ کردے گی۔ (۶ : ۱۱۷)

اسلامی یا یوں کہئے کہ قرآنی نکتۂ نظر سے جو تصوّرِ مملکت قرآن پیش کرتا ہے اس کی رُو سے حکومت کسی خاص گروہ یا پارٹی تک محدود ہو کر نہیں رہتی۔ بلکہ اس میں پوری کی پوری امّتِ واحدہ شامل ہوتی ہے۔ ممبرانِ شوریٰ کے تحت آنے والی اسلامی حکومت کے تصوّر کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کی تکمیل کا ذریعہ قرآنِ کریم کے احکامات اور اصول ہیں۔ اسلامی حکومت میں نہ کوئی بادشاہ ہوگا اور نہ پارلیمان کی اطاعت۔ اطاعت ہوگی تو خدا کے ابدی قوانین کی۔ یعنی اقتدارِ اعلیٰ صرف اور صرف خدا کی ذات ہے یعنی اطاعت ہوگی تو صرف اور صرف خدا تعالیٰ کے قوانین کی۔ ان قوانین کے اندر رہتے ہوئے حالات کے مطابق جزئیات کو طے کیا جائیگا یعنی آپس کے مشورہ سے۔ اس کے بارے میں قرآنِ پاک کی ایک پوری کی پوری سورۃ ہے جس کا نام ہی شوریٰ ہے۔ مومنین سے کہہ دیا گیا ہے کہ "ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے" (۴۲ : ۳۸)۔ مجلسِ شوریٰ میں یا پارلیمان میں وہ قانون کے طریقۂ نفاذ میں اختلاف ہو سکتا ہے جو کہ ہر معاملہ میں عارضی طور پر ضرور ہوگا۔ ایک امر کے فیصلہ ہونے کے بعد سب کے لئے واجب التّسلیم ہوگا۔ ایسے اختلاف کو جماعت بندی نہیں کہا جاسکتا۔ وقتی طور پر کسی مسئلہ کے اختلاف سے تمام اچھے اور بُرے پہلو نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ یعنی چھانٹی ہو جاتی ہے۔ گروپ بندی تو اس وقت ہوتی ہے جب مختلف جماعتوں کا پروگرام مختلف ہو اور اپنا اپنا منشور ہو۔ جب منشور ہی ایک ہو

تو پھر گروپ بندی کیسی۔

IDIOLOGY کے اشتراک سے حضورؐ نے ایک امت کی تشکیل فرمائی۔ جس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔ کوئی افتراق نہیں تھا۔ اس میں کوئی مذہبی فرقہ نہیں تھا۔ کوئی سیاسی پارٹی نہیں تھی۔ نہ ان میں عقائد کا کوئی اختلاف تھا نہ نظریات کی جنگ۔ منزل ایک تھی۔ راستہ ایک تھا، کارواں ایک تھا اور اس کارواں کا قائد ایک۔ ان کے سامنے جو اختلافی معاملہ آتا اس کا حل قرآن سے دریافت کر لیا جاتا۔ "جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو اس کے فیصلے کے لئے خدا کی طرف رجوع کرو" (۴۲ : ۱۰) اس طرح وہ اپنے خدا کی طرف رجوع کیا کرتے تھے نہ کہ کسی اور کے آگے۔ اس طرح وہ کامیاب و کامران ہوئے اور ہم قرآن کو چھوڑ کر ذلیل و رسوا ہوئے۔

کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم جرأت سے کام لیں اور اپنی درستگی کی طرف توجہ دیں۔ خط و خال میں درستی کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اس اسلامی نظام کی طرف پلٹ جائیں جو عہدِ محمدؐ میں قائم ہوا تھا۔ اس نظام میں:

۱ سارے مسلمان امتِ واحدہ تھے۔ ان میں نہ مذہبی فرقے تھے نہ سیاسی پارٹیاں نہ ذاتیں نہ برادریاں نہ صوبوں کی تفریق نہ نسلی امتیاز۔

۲ اس میں مملکت کا اقتدارِ اعلیٰ خدا کی کتاب کو حاصل تھا

۳ امت کے نمائندے قرآنِ کریم کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے باہمی مشاورت سے جزوی قوانین وضع کرتے جن کا اطلاق تمام افرادِ امت پر یکساں ہوتا۔

۴ اس میں تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام تھا جس کی رُو سے اقدارِ خداوندی کی طلب دل کی گہرائیوں سے ابھرتی اور اس طرح۔ افرادِ امت کا کردار، پاکیزگیٔ اخلاق کا بلند ترین نمونہ بن جاتا۔ اسی کا نام سنّتِ رسول اللہؐ کا اتباع تھا۔

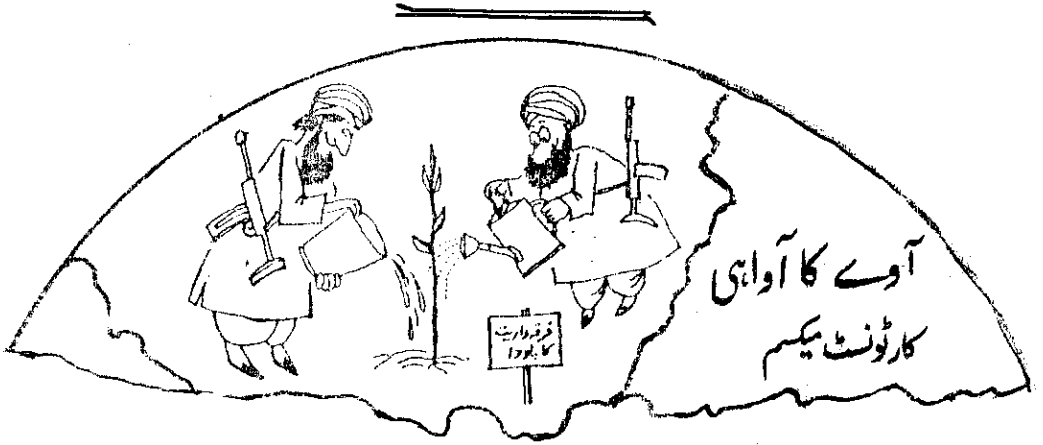

دعوت نامہ

سالانہ کنونشن 1994ء

طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن اپنے روایتی وقار و سنجیدگی اور سادگی و شادابی کے ساتھ جناح ہال لاہور میں منعقد ہوگی

پروگرام — طلباء و طالبات کے لیے کل پاکستان انعامی مقابلہ مقالہ نگاری

اوقات :	عنوانات :	لیول :
جمعہ 4 نومبر ساڑھے نو بجے صبح	○ بنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے	— یونیورسٹی
3 بجے بعد دوپہر	○ خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے ؟	— کالج
ہفتہ 5 نومبر 3 بجے بعد دوپہر	○ عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی	— سکول

سیمینار

ہفتہ 5 نومبر ساڑھے نو بجے صبح ○ **کیا اِسلام ایک چلا ہُوا کارتوس ہے ؟** — اہلِ فکر و نظر

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے طلوعِ اسلام کے اجلاس کی حیثیت عام پبلک جلسوں جیسی نہیں ہوتی۔ یہ ایک طرح کی فکری محفلیں ہوتی ہیں جن میں نظم و ضبط اور آدابِ مجلس کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

باہر سے آنے والے مہمانوں کے لیے بشرطِ اطلاع، کیمپ میں رہائش کا بندوبست کر دیا جائے گا۔

بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اعزاز الدّین احمد خاں
چیئرمین اِدارہ طلوعِ اسلام۔ لاہور

اِطلاع

محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ بعارضہ جگر سخت بیمار ہیں۔ بیمار پرسی کے لئے آپ انہیں درج ذیل ایڈریس پر لکھ سکتے ہیں۔

26، کیو، گلبرگ 2۔ لاہور۔ فون: 873430

عامر نوی والا

آج کا سندھ

قوموں کے عروج و زوال آنے والی قوم کے لئے ایک سبق کی مانند ہوتے ہیں کیونکہ وہی قوم دنیا میں فلاح پاتی ہے جو اپنے ماضی کی غلطیوں کو نہیں دہراتی بلکہ اُن غلطیوں اور کوتاہیوں سے مشعلِ راہ کا کام لیتی ہے۔ اس ضمن میں جب ایک مسلمان قوم اپنے ماضی پر نظر ڈالتی ہے تو اُسے تاریخ کے بڑے بڑے انقلابات نظر آتے ہیں جن میں سب سے بڑا انقلاب حضورؐ کی بعثت اور قرآن شریف کا نزول ہے۔ اس انقلابِ عظیم کے بعد جتنے بھی انقلابات امتِ مسلمہ کے ہاتھوں پیدا ہوئے ان سب کا تعلق قرآنِ کریم کی تعلیمات سے تھا۔ ہمیں یہ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ جب بھی اسلام اور اسلام کے حامیوں کا ٹکراؤ غیر اسلامی قوتوں سے جس شدت سے ہوا اسی شدت سے انقلاب برپا ہوا۔ یہ اسلامی تعلیمات کا ایک حقیقی جزو ہے۔ تاریخ اس کی شاہد ہے۔ ان ہی تعلیمات کے زیرِ سایہ ایک انقلاب جنوبی ایشیا میں بھی برپا ہوا اور جسے زیادہ مدت نہیں گزری اور جس کے نتیجے میں اس خطے کے رہنے والے مسلمانوں کو آزاد ریاست پاکستان کے قیام کی کامیابی حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کی اس کامیابی کا راز بھی قرآنِ کریم کی وہ تعلیمات تھیں جن کو یہاں کے مسلمان بھلا چکے تھے اور جو ہمیں سرسید احمد خاں علامہ اقبالؒ، محمد علی جناحؒ، محمد علی جوہرؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ[1] وغیرہ جیسے لیڈروں سے دوبارہ نصیب ہوئی اور ان ہی تعلیمات کے زیرِ سایہ عوام کا شعور پیدا ہوا جس نے انگریزوں اور ہندوؤں سے مسلمانوں کو نجات دلائی۔ حجاج بن یوسف اور محمد بن قاسم کا بویا ہوا درخت، جو اپنی شگفتگی کھوتا جا رہا تھا ایک بار پھر ہرا بھرا نظر آنے لگا۔

---

[1] گو مولانا آزاد نظریۂ پاکستان کے حامی نہ تھے لیکن اجتماعی طور پر وہ مسلمانوں کے لیڈر تھے اور ان کی تعلیمات نے سارے مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کو مشعلِ راہ کا کام انجام دیا ہے۔

جب ہم ان انقلابات کے مثبت نتائج پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں بحیثیت مسلمان بہت خوشی ہوتی ہے۔ لیکن ہماری آنکھ اس وقت نم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی جب ہم ان طویل قربانیوں پر نظر ڈالتے ہیں جو انقلاب کے نتیجے کو مثبت نتائج میں بدلنے کے لئے مسلمانوں نے دی ہیں۔ پاکستان کے انقلاب میں بھی قربانیوں کے ان گنت قصے جنم لیتے ہیں جن کے بارے میں ہم سے زیادہ کون واقف ہوسکتا ہے۔ اس انقلاب کی وجہ صرف ایک امید تھی کہ یہاں کے مسلمان اپنی زندگی اسلام کے اصولوں پر گذار سکیں اور چونکہ اسلام صرف انقلابی تعلیمات کا ہی محور نہیں بلکہ اس کا دائرۂ کار ساری کائنات کے علوم ہیں اور جو زندگی کے ہر شعبے میں انسانیت کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اسی لئے یہاں کے مسلمانوں کی جدوجہد نے ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے سامنے اپنی حیثیت کو پاکستان کے نام سے متعارف کرایا۔

پاکستان ! ہمارے انقلابی بزرگان کی خوابوں کی تعبیر۔

پاکستان ! مسلمانوں کے لئے امن کا گہوارہ۔

پاکستان ! دنیا کے مسلمانوں کے لئے رہنمائی کا مرکز۔

پاکستان ! اسلام کے وجود کا ثبوت اور

پاکستان ! مسلمانوں کے مستقبل کا امام

مگر یہ کیا ! پاکستان کی اپنی تاریخ ہمیں یہ کیا بتا رہی ہے۔ وہ پاکستان جسے مسلمانوں کے لئے امن کا گہوارہ ہونا تھا اس میں یہ بدامنی کیسی ؟ پاکستان غیر مسلم قوتوں کی رہنمائی میں ان کے پیچھے پیچھے کیوں ؟ اور پاکستان مسلمانوں کا امام ہونے کی بجائے مسلمانوں کی تفریق کا باعث کیوں ؟ وجہ صرف یہ تھی کہ مسلمانوں نے پاکستان تو حاصل کر لیا ان غیر اسلامی قوتوں کو شکست دے کر لیکن اسے آگے نہ بڑھا سکے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا ؟ اس کا جواب ہمیں مسلمانوں کی تاریخ میں بہت کھلے الفاظ میں مل جائے گا اور وہ جواب یہ ہے کہ خلفائے راشدینؓ کے دور کے بعد جب بھی مسلمان مضبوط ہوئے ان کی طاقت کو ختم کرنے کے لئے غیر اسلامی قوتیں متحد ہو کر اسلام اور اسلام کے حامیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ وہ اسلام کو تو ختم نہ کر سکیں مگر انہیں اسی نام کے زیر سایہ تفرقے میں ڈال دیا اور مسلمان اپنی ہی گردنیں آپ مارنے لگے۔ اس کی سب سے جدید مثال خلیج اور ایران عراق جنگ ہے۔ ان غیر اسلامی قوتوں نے مسلمانوں کو اس قدر گمراہ کر دیا کہ وہ قرآنِ کریم کی وہ آیت بھی بھلا بیٹھے جس میں کہا گیا ہے کہ

و اعتصموا بحبل اللہ جمیعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا۔

اور اللہ کی رسی (اللہ کے عطا کردہ نظام) کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقے میں

نہ پڑو۔"

——— ایسا ہی کچھ ہمیں پاکستان کی تاریخ میں نظر آئے گا۔

پاکستان بنتے ہی قائداعظم محمد علی جناحؒ کا سایہ ہمارے سر سے اُٹھ گیا۔ لیاقت علی خان کو گولی مار دی گئی اقتدارِ پاکستان میں ہلچل مچائی گئی اور پاکستان میں ملوکیت کے نظام کو پھیلایا گیا جمہوریت کا نام دے کر جس سے اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ آگیا جنہیں عالمِ اسلام کے مفادات کی بجائے اپنے مفادات زیادہ عزیز تھے اور ایسے چند گنے چنے افراد کو اتنا بااختیار اور جابر بنایا گیا کہ وہ اپنی ہی رعایا پر ظلم کے پہاڑ توڑنے لگے اور اس قدر انہیں پریشان کیا گیا کہ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے مسلمانوں نے ہندوؤں کو دعوت دی کہ وہ آکر ان کے زخموں پر مرہم رکھیں اور انہیں اپنے "مسلمان" بھائیوں سے نجات دلائیں۔ مشرقی پاکستان کی اس دعوت پر ہندوؤں نے بنگلہ دیش بنانے میں ان کی مدد کی اور یوں غیر مسلم عزائم کی کامیابیوں میں سے ایک عزم کی کامیابی اس ملک کو دو ٹکڑے کرکے حاصل ہوئی۔ ذرا سوچئے کہ وہ کون سے حالات ہو سکتے ہیں کہ بنگلہ دیش کے وہ عوام جو ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوؤں اور انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے اپنے "مسلمان" بھائیوں کے ساتھ رہنے کے لئے سب سے پہلے پاکستان ریزولیوشن (PAKISTAN RESOLUTION) پیش کرتے ہیں اور انتخابات میں مسلمانوں کا سو فیصد ساتھ دیتے ہیں اور اپنا یہ مقصد حاصل کرنے کے صرف ۲۴ سال بعد انہی ہندوؤں سے مدد لے کر ان "مسلمانوں" سے "نجات" حاصل کرتے ہیں۔ کافی غور طلب بات ہے اور غور کرنے کے لئے تاریخ شاہد ہے کہ ہمیشہ سے یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ غیر اسلامی قوتیں مختلف رنگ میں اپنے مقاصد اور عزائم میں مسلمانوں کے خلاف اسی طرح عمل پیرا رہی ہیں

حدیثُ النبیؐ

میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں جس سے اگر تم وابستہ رہے، تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔ وہ چیز کتاب اللہ ہے۔ (مسلم۔ نسائی۔ ابوداؤد)

وزیرزادہ مروانوی

زندگی کا حسین تصوّر

قارئین کرام! دنیا کی ہر زبان میں فن پارے ہوتے ہیں. ضروری عمل یہ ہے کہ اسے دوسری زبان میں منتقل کیا جائے تاکہ دوسرے بھی اس سے متاثر ہوسکیں. ذیل کی تحریر ہفت روزہ بادبان مردان میں شائع ہوئی تھی. مجھے اچھی لگی. پشتو سے اُردو میں ترجمہ کیا اور قارئین طلوع اسلام کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں

(ڈاکٹر غلام محمد غلام)

حسن کا مادہ (ح. س. ن) ہے. عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ ایّام جاہلیت (قبل از اسلام) کے عرب بالعموم جاہل، گنوار اور وحشی تھے جنہیں نہ کوئی ذوقِ سلیم سے کوئی واسطہ تھا نہ حسِ لطیف سے کوئی بہرہ. ایسا سمجھنا صحیح نہیں. ان کے ذوقِ لطیف کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ ان کے حسن کی تعریف تھی صحیح صحیح توازن اور تناسب (PROPORTION). حسن کی اس سے بہتر اور جامع تعریف ممکن ہی نہیں. اور یہ بات وہی قوم کہہ سکتی ہے جسے ذوقِ سلیم اور حسِ لطیف کا بہرہ وافر عطا ہوا ہو.

حُسن کا نام ہی صحیح تناسب ہے. شاعر کا مادہ (ش. ع. ر) ہے. یہی مادہ شعور (محسوسات) اور بال کا ہے (شعر). یعنی کسی معاملے پر بال کی باریکی کی طرح غور کرنا. شاعر اور ادیب بڑے حساس ہوتے ہیں. یہ کائنات میں بکھرے ہوئے حسن کو نظر انداز نہیں کرسکتے. یہ ہر حسین شے کا مقابلہ اپنی تصوراتی محبوبہ کے حسن سے کرتے ہیں. ہر شاعر اور ادیب کا یہ قاعدہ رہا ہے کہ وہ اپنی خیالی محبوبہ کے حسن کو سامنے رکھ کر عروسۂ کائنات کی مانگ میں خوبصورتی کے پھول ٹانکتا ہے۔ اور بزمِ ہستی میں فنکارانہ انداز سے اپنے کلام کے ذریعے حسن و رعنائی اور رنگینی تقسیم کرتا ہے. اس طرح وہ بگڑتے ہوئے معاشرے کو سنوارنے میں لگا رہتا ہے.

یہ حسن ہوتا کیا ہے؟ عربی لغت کے حوالے سے اوپر بیان کرچکا ہوں کہ ہر چیز میں توازن و جمال، زیبائی و رعنائی نیز خوشی و مسرت کے تمام گوشے، آرٹ کے شاہکار ہوں یا حیات افروز موسیقی جس میں تناسب و موزونیت ہو وہ حسین ہے. صحیفۂ فطرت کائنات کی ہر حسین شے، ہر حسین منظر انسانی جذبۂ تحسین کو ابھارتا ہے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی تاکید کرتا ہے. اس میں انسان اور حیوان اور دیگر مظاہرِ فطرت سب آجاتے ہیں.

مگر اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے کچھ حدود و قیود مقرر ہیں۔ انسان کے لئے لازم ہے کہ اس سے تجاوز نہ کرے۔ بلاشبہ ایک توازن بدوش معاشرہ میں حسن کا اظہار آرٹ، نغمہ، صنفِ نازک وجہِ شادابی قلب و نظر بنتے ہیں مگر ایسے موقعہ پر ان حدود کا خاص خیال رکھنا ہوگا جو اللہ نے مقرر کئے ہیں۔ کیونکہ حسن (توازن) میں بگاڑ سے مضر اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں جہاں جنتی زندگی کا ذکر ہے وہاں حسن کا بھی خاص طور پر ذکر ہے یہ اس لئے کہ بنی آدم اپنے معاشرے کو اسی سانچے میں ڈھال دے تاکہ حسن (توازن) برقرار رہے، بگاڑ نہ آنے پائے۔

حُسن سے یہ بھی مراد ہے، اعضاء کا ٹھیک ٹھیک توازن و تناسب اور بھلا لگنا اور اس کی ضد ہے فساد یعنی بگڑا ہوا غیر متوازن۔ اگر کسی وجہ سے معاشرے کے کسی فرد میں یا اس کی قوت اور صلاحیت میں کوئی کمی ہوئی ہو تو اُسے پورا کرنے کا نام بھی حُسن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے آپ کو احسن الخالقین کہتا ہے اور معاشرہ میں حسین اور مُحسنین وہی افراد کہلاتے ہیں جو نہ صرف اپنے سیرت و کردار میں حسن (توازن) رکھتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اعتدال و حسن کا رانہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور انہیں سکون و اطمینان کی زندگی گزارنے میں تعاون کرتے ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت "احسن" ہے۔ لہٰذا اس صفت کو اختیار کرنے کی جو بھی کوشش کرے گا وہ گویا اللہ کے رنگ میں رنگا جائے گا۔ اس کا یہ عمل حسین کہلائے گا یہی وجہ ہے کہ یہ حسین طرزِ زندگی اپنانے کے لئے ہم یہ آرزو کرتے ہیں کہ یا اللہ دنیا و آخرت دونوں میں حَسَنَۃً حسین اور توازن بدوش زندگی عطا کر۔ یہی ہماری زندگی کا مقصد و منتہیٰ ہونا چاہیئے۔ ہمیں اس کے لئے جدّوجہد کرنی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے تو یہاں تک فرمایا کہ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (۱۷/۵۳) نہایت خوبصورت انداز سے اعتدال کے ساتھ اچھی اچھی باتیں کرو۔ معاشرے میں حسن جب ہی پیدا ہوگا جب افراد اپنی اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھے، اسی کا نام احسان ہے۔ اگر ایک مزدور کی دہاڑی دس روپیہ ہے تو یہ ہوا اس کا حق، اگر آپ نے پندرہ دئے تو یہ احسان ہوگا۔

ادباء و شعراء کی خدمت میں درخواست ہے کہ حسن کے ان پہلوؤں اور مفہوم کو بھی مدِنظر رکھا کریں تاکہ وہ اپنے کلام اور پیغام کے ذریعے بگڑے ہوئے توازن کو سہارا دے سکیں اور اظہارِ حسن کے لئے ناپسندیدہ اہداف کے بجائے پاکیزہ خیالات کو اپنائیں۔ اس سے زندگی سین سے حسین تر ہوتی چلی جائے گی۔

علی محمد چدھڑ

سائنس اور علماء

ملک کے ممتاز علماء دین نے ۱۶ جولائی کے حوالے سے کہا ہے کہ اس روز تمام مسلمان اللہ کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگیں اور اسلام کے منافی طرزِ عمل سے ہمیشہ کے لئے توبہ کریں۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے ۱۶ جولائی کو سیارہ مشتری میں تباہی کے حوالے سے ایک سوال کے جواب میں کیا۔ بعض علمائے کرام نے رائے ظاہر کی کہ یہ سب اللہ کے حکم سے ہوتا ہے اور آثار بتلا رہے ہیں کہ قیامت قریب ہے۔ بعض نے خیال ظاہر کیا کہ اللہ سے پناہ مانگنے کے علاوہ قرآن میں دی گئی دعائیں بھی مانگنی چاہئیں۔ بعض نے مشورہ دیا کہ اس روز (۱۶ جولائی) کو امت کو دیگر مشاغل ترک کر کے مساجد کا رُخ کرنا چاہیئے۔ بعض نے کہا کہ مسلمان اللہ کے حضور اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کریں۔ مظلوموں پر ظلم ڈھانے بند کردیں۔ پوری امتِ مسلمہ سربسجود ہو کر توبہ استغفار کرے۔ حسبِ توفیق زیادہ سے زیادہ صدقہ خیرات ہو تاکہ یہ عذاب ٹل سکے۔ فاضل علماء کا یہ بیان ۱۲ جولائی ۱۹۹۴ء کے روزنامہ "پاکستان" میں شائع ہوا ہے۔

مختلف مکاتبِ فکر کے دینی راہنماؤں نے جس ردِ عمل کا اظہار کیا ہے وہ افسوسناک ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ مسلمان سکالرز اور سائنسدانوں کو سلسلۂ کائنات کے مظاہر کا مشاہدہ کرنے کی ترغیب دیتے الٹا انہوں نے پاکستانی مسلمانوں کو ہراساں کر دیا ہے۔ اس سے ایک تو ان کی راہنمائی کے انداز اور معیار کا پتہ چلتا ہے۔ دوسرے مروجہ مذہب جسے حقیقی اسلام کے طور پر پیش کیا جاتا ہے' کا لبِ لباب بھی سامنے آگیا ہے۔ مذہبی ہدایات جو ایسے موقعہ پر فریضہ کے طور پر جاری کی جاتی ہیں' سے معلوم ہوتا ہے کہ باقی سب ٹھیک ہے۔ اگر مبینہ ہدایات پر عمل ہو جائے تو آنے والی بلا ٹل سکتی ہے۔ کسی قوم کی بدقسمتی کی انتہا اس وقت ہوتی ہے جب اسے اپنے اعمال اور ان کے نتائج کا احساس ہی نہ رہے۔ اس سے ایک تو حق و باطل کی تمیز مٹ جاتی ہے دوسرے باطل نظریات کو بزعمِ خویش حق سمجھ کر اختیار کر لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی بداعمالیوں کے فطری نتائج سہانے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ہمارے علمائے کرام صرف طبیعی آفات کو ہی عذاب کے زمرے میں شامل کرتے ہیں۔ آخر انہیں افغانستان، بوسنیا، صومالیہ، فلسطین، کشمیر، الجزائر، فلپائن کے مظلوم اور بے یار و مددگار مسلمانوں کی تباہی

کیوں نظر نہیں آتی۔ کیا تمام عالمِ اسلام اس وقت بحیثیت مجموعی یہود و نصاریٰ کا دستِ نگر نہیں۔ کیا غلامی بھوک اور اغیار کی محتاجی کو قرآن نے عذاب نہیں کہا۔ کیا ایسے عذاب کے بچاؤ کے متعلق ہم نے کبھی سوچا ہے۔ افسوس کہ کتاب اللہ سے روگردانی نے ہماری عقل و بصیرت بھی چھین لی ہے اور ہمیں قرآن میں حضور سرورِ کائنات کی یہ پکار سنائی نہیں دیتی کہ

"اے میرے رب! یہی ہے میری قوم جس نے اس قرآن کو مہجور بنا رکھا تھا (انہوں نے اپنے آپ کو اس کے تابع رکھنے کے بجائے اسے اپنے مسلک و مشرب کے تابع رکھ چھوڑا تھا" (۳۰/ ۲۵)۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم مکاتبِ فکر کی آڑ میں فرقہ بندی کا مکروہ کاروبار کر رہے ہیں جب کہ قرآن کہتا ہے کہ

"جنہوں نے راہیں نکالیں اپنے دین میں اور ہو گئے کئی فرقے (سوائے رسولؐ!) تجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کا کام حوالے اللہ کے۔ پھر وہی جتا دے گا ان کو جیسا کچھ کرتے تھے" (۶/۱۶۰)۔

قرآن نے فرقہ پرستی اور گروہ بندی کو شرک کہا ہے جو بڑا سنگین جرم ہے۔ اب ایسے گناہ کی معافی کیا خدا سے مل سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ

"خدا شرک کو نہیں بخشتا اور اس سے نیچے جس کو چاہے بخشتا ہے جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا اس نے بڑا طوفان باندھا" (۴/۴۸)۔

ظاہر ہے یہ فرقہ بندی جس کے سرپرست ہمارے مذہبی راہنما بنے ہوئے ہیں صریح طور پر قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ لیکن مصلحتاً اسے مکاتبِ فکر کا نام دے کر اللہ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ قرآن میں ہے کہ

"جو شخص اپنے جی سے باتیں گھڑے اور ان کے متعلق کہے کہ وہ خدا کی وحی ہے وہ کتنا بڑا مجرم ہوگا۔ دوسری طرف وہ شخص بھی کچھ کم مجرم نہیں ہوگا جس کے سامنے خدا کی سچی وحی آئے اور اُسے جھٹلا دے" (۱۰/۱۷)۔

ہمارے محترم علماء نے ہمیں اس روز مساجد کی طرف رُخ کرنے کی ترغیب بھی دی ہے۔ بڑی اچھی بات ہے۔ خدا ہمیں توفیق عطا فرمائے۔ لیکن جو مساجد مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کریں انہیں 'مسجدِ ضرار' کے لیبل سے بچانے کی بھی کوئی تجویز ہونی چاہیئے۔ اس لئے کہ وہاں اللہ کے نام پر مسلمانوں میں نفرتوں کے بیج بوئے جاتے ہیں۔ بقول شاعر ؎

اے خدا تجھ کو بتاؤں کیا تجھے معلوم ہے نفرتوں کے دیس تیرے نام پر کیسے بنے

دراصل حقیقی اسلام کی مساجد ہمیشہ فرقہ پرستی اور گروہ سازی کے شرک سے پاک ہوتی ہیں. خدا نہ کرے نہ صرف اس روز (۱۶ جولائی) بلکہ ہمیشہ کے لئے وہ اخوت، مساوات، ہمدردی، خیر خواہی اور محبت کا مظہر بن جائیں۔

جہاں تک توبہ استغفار کرنے یا پڑھنے کا تعلق ہے تو یہ کوئی چھومنتر کا کلام نہیں کہ زبانی و کلامی ورد کرنے سے کچھ مثبت نتائج برآمد ہو جائیں. سفرِ حیات میں ایک مقام پر دوراہا آتا ہے جہاں سے آپ کا قدم غلط سمت کی طرف اُٹھ جاتا ہے. اپنی غلطی معلوم ہو جانے کے بعد آپ پھر اُسی دوراہے پر واپس آجاتے ہیں جہاں سے آپ کا قدم غلط راستے پر پڑ گیا تھا. عربی زبان میں اس قسم کی واپسی کو "توبہ" کہتے ہیں. اس کا مثبت پہلو اس وقت شروع ہو گا جب آپ اُس دوراہے سے صحیح سمت کو چلنا شروع کر دیں گے۔ مروجہ فقہی مذہب سے تائب ہو کر صدرِ اوّل کے اسلام کی سمت پیش قدمی توبہ کی بہترین مثال ہے. مغفر اس خود کو کہتے ہیں جسے سپاہی سر کی حفاظت کے لئے میدانِ جنگ میں پہنتے ہیں. جب کسی مرض کے خلاف قوّتِ مدافعت مریض کے تخریبی عناصر سے حفاظت کرتی ہے تو اس عمل کو قرآن کی اصطلاح میں "مغفرت" کہتے ہیں. اگر تعمیری نتائج مرتب کرنے والی تدابیر زیادہ موثر ہوں گی تو وہ تخریبی نتائج پیدا کرنے والے عناصر پر غالب آجائیں گی اور مضرت رساں اثرات کا ازالہ کر دیں گی. اس حقیقت کو قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"یاد رکھو حسن پیدا کرنے والے اعمال، بگاڑ پیدا کرنے والی تدابیر کے اثرات کا ازالہ کر دیتے ہیں" (۱۱/۱۱۴)۔

ایک دوسری جگہ فرمایا۔

"جس کسی کا پلڑا جھک جائے گا، تو اس کی کھیتی پروان چڑھ جائے گی اور جس کا پلڑا ہلکا رہے گا تو یہ وہ لوگ ہوں گے جو جہنم میں رہیں گے" (۲۳/۱۰۲—۱۰۳)۔

مطلب یہ ہوا کہ گناہوں کے ازالہ کے لئے بخشش یا معافی جیسی وضعی اصطلاحات پر انحصار کے بجائے زیادہ سے زیادہ عملِ صالح کئے جائیں جس سے معروف کاموں کا پلڑا بھاری ہو جاتے۔

۱۶ جولائی کو دیگر احتیاطی تدابیر کے علاوہ، حسبِ توفیق، زیادہ سے زیادہ صدقہ خیرات دینے اور مظلوموں پر ظلم بند کرنے کی بھی اپیل کی گئی ہے. یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ جلو مشتری میں متوقع تباہی کے بہانے ہی سہی، ہمارے مذہبی راہنماؤں کو مظلوم اور صدقہ خیرات لینے والے بے نوا اور بے سہارا لوگ یاد آ گئے ہیں لیکن اس سلسلہ میں ان کا یہ شیوہ افسوسناک ہے کہ وہ غربت مفلسی اور امارت کی ذمہ داری مقدر یعنی خدا کے اوپر ڈال دیتے ہیں. یہ خود قوانین وضع کرتے ہیں اور لوگوں کو یہ کہہ کر فریب دیتے ہیں کہ وہ ارشادِ خداوندی ہیں۔

استحصالی قوتوں کے مارے ہوئے مفلس اور نادار انسانوں کو یہ تھپکی دی جاتی ہے کہ یہ سب خدا کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ انسان کو راضی برضا رہنا چاہیئے۔ حکومت اور دولت خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ وہ جسے چاہے امیر بنا دے اور جسے چاہے فقیر بنا دے' یہ سب مقدر کے ہاتھ میں ہے۔ علامہ اقبالؒ کے اس شعر میں ہے جو انہوں نے تمثیل میں ابلیس سے کہلوایا ہے۔

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

اسی طرف اشارہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک آمریت اور سرمایہ داری کو مذہبی پیشوائیت کی اشیرباد حاصل ہے۔ نہ آمریت کو کوئی زوال آسکتا ہے اور نہ سرمایہ داری کو کسی گزند کا احتمال ہے۔ ان تینوں طاقتوں کی ملی بھگت سے ہی بنی نوع انسان پر ملوکیت کی گرفت مضبوط ہو سکتی ہے۔ آپ نے یہ کبھی نہ دیکھا ہو گا کہ کوئی آمر مذہب کی نندیا کرے یا کوئی صوفی ملوکیت کے خلاف زبان کھولے۔ شاید اس لئے کہ صوفی و مُلّا ملوکیت کے ہیں بندے تمام۔ علامہ اقبالؒ کا 'ارمغانِ حجاز' میں فارسی کا ایک شعر ہے جس کا ترجمہ یوں ہے کہ ایک عیار جُبہ پوش نے اپنے بیٹے سے کہا کہ میں تمہیں ایک گُر بتلاتا ہوں جسے اچھی طرح سے گرہ میں باندھ لو۔ وہ گُر یہ ہے کہ اس دَور کے نمرودوں کے ساتھ یارانہ رکھو اور ان کے فیوض و اکرام سے "اسلام کا جھنڈا" بلند کرتے رہو۔ پاکستان کے ایک مشہور اسلام پسند آمر نے ۱۹۸۲ء میں کہا تھا کہ اسلام کی رو سے ایک شخص جس قدر جی چاہے دولت جمع کر سکتا ہے۔ اپنے اس بیان سے انہوں نے غریب طبقہ کو نظر انداز کر کے سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت دونوں کو خوش کر لیا۔

مولانا مودودی اپنی کتاب مسئلہ ملکیت میں لکھتے ہیں کہ جائز چیزوں سے ملکیت اور دولت بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ آج پاکستان میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا ایک محدود طبقہ جو مملکت خداداد کے تمام وسائل اور پیداواری ذرائع پر قابض ہے تو انہیں ملک کی مذہبی پیشوائیت کی مکمل حمایت اور تائید حاصل ہے۔ یہ بات عام عقل و فہم سے بالا اور بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے علماء کرام کو ملک کے ستر فیصد غریب اور مظلوم طبقہ کی یاد آگئی جبکہ ان کا استحصال کرنے میں وہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ساتھ برابر کے شامل ہیں۔ یہ خیال بڑا اذیت ناک ہے کہ کچھ سہل پسند اور مفت خور لوگ مزدوروں اور ناداروں کی کثیر آبادی کی محنت پر اپنے تعیش کے محل اسارنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔

حکمِ حق ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

ہمارے مروجہ مذہب نے ایک باطل عقیدہ یہ ایجاد کیا ہے کہ نادار اور مفلس انسانوں کا وجود لازمی ہے تاکہ امراء حضرات انہیں تھوڑا بہت، حسبِ توفیق، صدقہ خیرات دے کر ثوابِ دارین حاصل کرسکیں. کتنی عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو غلاموں اور لونڈیوں کے جواز کا دروازہ کھلا ہے. لیکن ساتھ ہی ان کے حق حقوق کی تلقین بھی ہوتی رہتی ہے. یتیم پوتے کو اس کی اپنی وراثت سے محروم کرکے چچاؤں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن اس کے سر پر خالی خولی ہاتھ رکھنے کا وعظ بھی جاری رہتا ہے. قرآن سونا چاندی اور مال و دولت جمع کرنے والوں کو دردناک عذاب کی خبر دیتا ہے لیکن ہمارے علماء حضرات ایسی کوئی پابندی قبول نہیں کرتے. سود کو صریحاً حرام قرار دیتے ہیں لیکن سود خوری کے "شرعی حیلے" بھی ایجاد کر لیتے ہیں. مزارعت، مضاربت کو عین اسلام خیال کرتے ہیں. کوئی چھوٹی بڑی رقم سود پر قرض دینا حرام ہے لیکن اگر اس رقم کا مکان بنا کر یا خرید کر کرائے پر دیدیا جائے تو یہ ساری کاروائی حلال ہو جاتی ہے. کیا یہ سب کچھ مظلوموں اور ناداروں سے ہمدردی کی علامت ہے.

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

ہمارے محترم راہنماؤں نے متوقع تباہی کو ٹالنے کی جو ہدایات قوم کو جاری کی ہیں وہ واقعی قابلِ ستائش ہیں لیکن بالکل سطحی قسم کی ہیں. مروجہ مذہب کے تو عین مطابق ہیں. لیکن دینی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے، تو اسلام کی نمائندگی نہیں کرتیں. شاید ہمیں اب بھی اپنے جرم کا احساس نہیں ہوسکا اور نہیں جانتے کہ جس راستے پر گامزن ہیں وہ تباہیوں تاریکیوں اور مختلف قسم کے عذابوں کا راستہ ہے. یہ صدرِ اوّل کی طرف لے جانے والی شاہراہ نہیں ہے اور ہماری حالت اس مسافر جیسی ہے جس کے متعلق ایک شاعر نے کہا تھا کہ

ہے شوقِ سفر ایسا۔ اک عمر سے یاروں نے

منزل بھی نہیں پائی رستہ بھی نہیں بدلا

ہم بہ حیثیت قوم سرطان کے مریض ہیں. لیکن علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقیؔ اور مرض کے مطابق علاج نہ کیا جائے تو موت یقینی ہے. ہم ضابطۂ خداوندی کے باغی ہیں. ہمارا رسولؐ ہمارے متعلق اللہ تعالیٰ سے شاکی ہے. وجہ یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو یکسر نظر انداز کردیا ہے. بتایا جائے کہ ہماری یہ دیدہ دلیری بغاوت سے کم ہے؟

قابلِ صد احترام علمائے کرام!

آپ نے اپنی مجوزہ ہدایت میں اپنے گناہوں کے کفارہ کی بھی بات کی ہے، تو گناہوں کی نوعیت کے پیشِ نظر بہترین کفارہ یہی ہوسکتا ہے کہ نظامِ سرمایہ داری کو مٹا کر قرآن کا معاشی نظام نافذ کردیا جائے. یکدم

نہ سہی، بتدریج پیش رفت یقینی طور پر ہو سکتی ہے۔ جہاں تک مسلکی اختلافات کا تعلق ہے وہ خدائی حکم کے مطابق، قرآنی اصولوں کے تحت دُور کر لئے جائیں۔ یاد رکھیں اس سے تمام بلائیں ہمیشہ کے لئے دور ہو جائیں گی۔ ظالموں کے ہاتھ رُک جائیں گے۔ مظلوم شادمان ہو گا۔ کسی کو صدقہ خیرات دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ قلیل اُجرت اور غلیظ مکانوں کے مکین خوشحال ہو جائیں گے۔ روٹی کے لئے ترستے ہوئے بچوں کا حسرت ناک منظر آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ مفلس والدین کا دُکھ حکومتِ اسلامیہ کے ذریعہ قانونِ خداوندی بانٹ لے گا اور لاغر و نیم برہنہ بچوں کی چیخ و پکار عرش تک پہنچنے سے پہلے ہی روک لی جائیگی۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

رابطہ

ادارہ طلوعِ اسلام سے رابطے کے لئے درج ذیل ذرائع نوٹ فرمایئے

اڈریس : 25۔ بی۔ گلبرگ 2، لاہور۔ پوسٹ کوڈ 54660

فون : 876219

فیکس : 92-42-876219

بنک : نیشنل بنک آف پاکستان، مین مارکیٹ، گلبرگ 2۔

کرنٹ اکاؤنٹ نمبر: 3082

نوٹ : فیکس مشین پانچ دفعہ گھنٹی بجنے کے بعد دن رات کام کرتی ہے۔

فیکس مشین کا عطیہ
ڈاکٹر عزیز الرحمٰن ارائیں (امریکہ)

بچوں کے لئے

دُوسروں کے لئے جیئو

یہ ایک پرانا محاورہ ہے کہ "کُتّا کُتّے کا وَیری ہوتا ہے" جو آج بھی اتنا ہی صحیح ہے جتنا اس وقت جب یہ محاورہ بنا تھا۔ کتّے میں بڑے وصف ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ مالک کا وفادار ہے۔ جس کا کھاتا ہے اسی کا ہو رہتا ہے۔ مالک کی چوکیداری پوری مستعدی سے کرتا ہے۔ بلّی کو تم گھر میں رکھ کر پالتے ہو مگر وہ تمہاری بلّی تمہی سے میاؤں کرے گی۔ تم اسے کسی بات سے روکو، تو تمہارا سارا احسان بھُول کر تمہیں گھُرکے گی دودھ کے برتن کو ہزار چھپا کر رکھو وہ اسے چھیڑنے کی ضرور کوشش کرے گی۔ کبھی کبھی بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ بھی جائے گا۔ بلّی کے برعکس کتّا بھُوکا مر جائے گا مگر مالک کی اجازت کے بغیر کھانے پینے کی چیز کو نہیں چھیڑے گا۔ ایسے بھی واقعات ہوئے ہیں کہ کتّا اپنے مالک کے ساتھ کسی ویرانے میں گیا۔ وہاں مالک کو کسی دشمن نے مار ڈالا۔ کتّا بھوکا پیاسا اپنے مالک کی لاش اور اس کے بعد اس کی قبر کے پاس بیٹھا رہا۔ گویا کتّا اپنے مالک کا وفادار اس کی زندگی میں بھی ہوتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد بھی۔

اتنے بڑے وصف کے ہوتے ہوئے بھی کُتّا بدنام ہے۔ تم کسی بُرے آدمی کو مہذّب گالی دینا چاہتے ہو تو اُسے کتّا کہہ دیتے ہو۔ کوئی شخص فضول اور بے کار باتیں کرنے لگے تو تم کہتے ہو۔ "کتّا بھونک رہا ہے"۔ آخر وہ کونسی بُری بات ہے جس سے کتّے کی ساری خوبیاں ضائع ہو گئیں؟ یہ بُری بات صرف یہ ہے کہ کتّا کتّے کا ویری ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہم جنس کو دیکھ کر غصّے سے بھر جاتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی غرّانے لگتا ہے بھونکتا ہے۔ اس کو بھگانے کی کوشش کرتا ہے۔ خود ہڈی لے کر بیٹھا ہو تو ہر راہ جاتے کتّے پر یوں قہر بھری نظریں ڈالتا ہے گویا وہ اس سے ہڈی چھیننے آیا ہے۔ اُسے اپنے ہم جنس کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ محض یہی نہیں کہ ہمدردی نہیں ہوتی بلکہ اس سے نفرت ہوتی ہے مالک کا وفادار اور جانثار کتّا اپنے بھائی کی جان کا دشمن ہوتا ہے۔ کتّے کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنی گلی میں شیر ہوتا ہے۔ کوئی اجنبی کتّا بھولے بھٹکے اس کی گلی میں آ جائے تو وہ اس کے سر

ہو جاتا ہے۔ خود بھونکتا ہے۔ بھونک بھونک کر گلی کے تمام دوسرے کتوں کو بلاتا ہے اور سب کتے مل کر اس مسافر کتے کو دور بھگا دیتے ہیں۔

اب تک بات کتے کی ہو رہی تھی تم یقیناً سوچ رہے ہو گے کہ کتے کی یہ عادت بہت بُری ہے کہ وہ اپنے بھائی کو دیکھ کر نفرت اور غصے سے بھر جاتا ہے۔ دوسرے کتے کو تکلیف پہنچا کر اسے راحت ملتی ہے۔ وہ خود حرص اور لالچ سے کھا پی لیتا ہے مگر دوسرے بھوکے کتے کو حصہ نہیں دیتا۔ اپنوں کے ساتھ اسے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔

اب تم تھوڑی دیر کے لئے کتے کو الگ کر دو اور یہ سوچو کہ تم سے کوئی یہ کہے۔ "فلاں شخص اپنے بھائی کو دیکھ کر نفرت اور غصے سے بھر جاتا ہے۔ دوسرے آدمی کو تکلیف پہنچا کر اسے راحت ملتی ہے۔ وہ خود حرص اور لالچ سے کھا پی لیتا ہے مگر دوسرے بھوکے آدمی کو حصہ نہیں دیتا۔ اپنوں کے ساتھ اسے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی"۔۔۔ تو اس شخص کے متعلق تمہاری کیا رائے ہو گی۔ تم یقیناً کہو گے کہ یہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ یہ خود غرض آدمی ہے۔ وہ صرف اپنی ذات کا بھلا چاہتا ہے۔ دوسرے کی تکلیف سے اسے تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض اوقات تو دوسروں کی تکلیف سے اسے لذت محسوس ہوتی ہے۔

یہ انسان، انسان ہونے کے باوجود انسانیت سے عاری ہوتا ہے۔ حیوان اور انسان میں فرق یہی ہے کہ حیوان اپنی ذات کے لئے جیتا ہے۔ وہ اپنے فائدے کا خیال رکھتا ہے۔ اور بس دوسرے کے فائدے سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی مگر انسان صرف اپنے لئے نہیں بلکہ اس کے ساتھ دوسروں کے لئے بھی جیتا ہے۔ یہ جو تم نے پچھلے بھارت کے ساتھ جنگ کے دوران یہ دیکھا، سنا اور پڑھا ہے کہ ہمارے لوگوں نے "قربانی" دی تو اسکا مطلب یہی ہے کہ ان لوگوں نے اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے، ملک کے لئے اور قوم کے لئے اپنا آرام، اپنا مال متاع بلکہ اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔ دنیا میں لوگوں نے دولت کے ڈھیر اکٹھے کئے۔ حکومت کا دبدبہ پیدا کیا مگر دنیا نے یاد ان کو رکھا جن کے پاس یہ جذبہ تھا کہ وہ دوسروں کی خاطر زندہ رہیں گے اور دوسروں کی خاطر مریں گے۔ خالد بن ولیدؓ، محمد بن قاسمؒ، طارق بن زیادؒ کے نام صدیوں سے عقیدت اور محبت سے لئے جاتے ہیں اور انھیں ہمیشہ اسی عزت اور پیار سے یاد کیا جائے گا۔ ابھی کل تک کسی نے عزیز بھٹی، خادم حسین، شفقت بلوچ، عالم، ظفر مسعود کا نام تک نہ سُنا تھا مگر آج تم میں سے کون

ایسا ہے جو ان کی تصویریں گھر میں رکھنا نہیں چاہتا۔ ان کا ذکر کسی محفل میں چلتا ہے تو سنانے والے سُنا سُنا کے نہیں تھکتے اور سننے والے سنتے سنتے اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے۔

ان شہیدوں اور غازیوں کا کمال کیا ہے؟ یہی نا کہ انھوں نے اپنے فائدے کی، اپنے آرام کی پروا نہ کی بلکہ تن من دھن سب کچھ نچھاور کر دیا ــــ محض اس خیال سے کہ قوم سربلند ہو۔ وطن محفوظ رہے تاکہ اس میں اسلام کا بول بالا ہو سکے۔

آج جب تم عزیز بھٹی کی تصویر والا کیلنڈر گھر میں لٹکاتے ہو یا یونس حسن کی تصویر کاٹ کر اپنے البم میں سجاتے ہو تو سوچو کہ کیا تم نے اپنے آپ کو ان بہادروں کے نقشِ قدم پر چلنے کے لئے تیار کر لیا ہے۔ کل یہ کام تمہیں کرنے ہوں گے جن کی وجہ سے ان بہادروں کے نام آج تم فخر سے لیتے ہو۔ ان شیر دل مجاہدوں نے اپنے خون سے جو شمع روشن کی ہے اسے لے کر تمہیں آگے بڑھنا ہے۔ انھوں نے جو کام ادھورا چھوڑا ہے اُسے تمہیں پورا کرنا ہے۔ انھوں نے جو راہیں بنائی ہیں ان پر چل کر تمھیں اسلام کا جھنڈا اونچا رکھنا ہے۔

تم پر جو ذمہ داریاں آگے چل کر آنے والی ہیں۔ ان کے لئے تم کس حد تک تیاری کر رہے ہو؟ ــــ اس کو تم ایک پیمانہ سے ناپ سکتے ہو۔ آج تمہیں ایک آئینہ دیا جاتا ہے۔ اسے سامنے رکھ کر تم اس میں سے اپنے آپ کو بخوبی دیکھ سکو گے۔

دیکھنا یہ ہے کہ سکول میں اپنی جماعت کے کمرہ میں بنچ یا ڈیسک پر بیٹھتے ہوئے تم کسی ساتھی یا ہم جماعت کو دیکھ کر اور پھیل جاتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ نہ بیٹھ سکے یا تم سکڑ کر اسے خود پاس بیٹھنے کی دعوت دیتے ہو؟

بس میں سوار ہوتے وقت ہلڑ بازی کرتے ہوئے، قطار توڑتے ہوئے، اندر داخل ہوتے ہو یا شرافت سے ان لوگوں کو پہلے چڑھنے کا موقع دیتے ہو جو قطار میں تم سے آگے کھڑے ہوتے ہیں؟ اور پھر بس میں پہنچ کر تم جلدی جلدی سیٹ پر بیٹھ جانے کی کوشش کرتے ہو، یا کسی بوڑھے، معذور یا اپنے سے کسی چھوٹے کو سیٹ پر بٹھا کر خود کھڑے رہتے ہو؟

دوستوں اور ہم جولیوں میں تم اپنی ہی باتیں کہے چلے جاتے ہو یا اپنی کہہ کر دوسروں کو بھی کہنے کا موقع دیتے ہو؟

گھر میں کبھی کوئی مٹھائی وغیرہ آتی ہے، تو تم ضد اور لالچ کر کے اپنے حصّے سے زیادہ کھا لینے کی کوشش کرتے ہو یا اپنے بہن بھائیوں میں بیٹھ کر محض اپنے حصّے کی چیز کھا کر مطمئن ہو جاتے ہو؟

ایسا تو نہیں کہ گھر میں جو کچھ پکتا ہے وہ عام طور پر تمہیں پسند نہیں ہوتا اور ہر روز تم نئی چیز کی فرمائش کر دیتے ہو؟

ابا اور امی کو تم بے جا ضد اور شور و غوغا سے پریشان رکھتے ہو یا ان کے کام میں ہاتھ بٹا کر یا اچھی اچھی باتیں کر کے ہی ان کا دل خوش کرنے کی کوشش کرتے ہو؟

تم ایسا تو نہیں کرتے کہ جس امتحان میں تم فیل ہو جاتے ہو اس کی رپورٹ تم گھر لاتے ہی نہیں اور جھوٹ بول دیتے ہو کہ رپورٹ ملی ہی نہیں؟

روتی ہوئی چھوٹی بہن یا روتے ہوئے چھوٹے بھائی کو روتا دیکھ کر تم اس کا منہ چڑاتے ہو تاکہ وہ اور روئے یا اسے اٹھا کر اس کا جی بہلاتے ہو؟

اپنے کسی دوست، ہم جماعت یا ساتھی کو اداس دیکھ کر تم اس سے کنّی کترانے کی کوشش کرتے ہو یا اس سے اس کی اداسی کی وجہ پوچھتے ہو؟ اور اس کے ساتھ مذاق کرنے کی بجائے اس کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہو؟

تم کتنی بار ضرورت کے بغیر نئی کاپی، ..... نیا قلم، نیا پنسل تراش (شارپنر) یا نئی پنسل خرید لیتے ہو؟ اور آئندہ تم نے بلا ضرورت پیسے خرچ کرنے سے بچنے کے لئے پکا ارادہ کر لیا ہے یا نہیں؟

پچھلی مرتبہ تمہیں ضابطے اور قاعدے کی پابندی کرنے کا جو طریقہ بتایا گیا تھا اس پر تم نے کس حد تک عمل کیا ہے؟

یہ اور اس طرح کی بے شمار چھوٹی چھوٹی باتوں سے تم اپنی جانچ پڑتال کر سکتے ہو۔ اس طرح کی جانچ پڑتال کر کے تم جہاں کہیں خرابی دیکھو اسے خود ہی ٹھیک کرنے کی کوشش کرو۔ آج کے غازیوں کے گن گانے والی قوم کل تمہارا نام لے کر فخر کرے گی۔

بچو! یہ مضمون آپ کے لئے یونس بھائیجان نے لکھا تھا جواب ہم میں نہیں ہیں۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔ ایک شخص نے رسول اللہ سے پوچھا کہ کون سا مسلمان بہتر ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ وہ جس کی زبان اور ہاتھ سے کسی کو ایذا نہ پہنچے۔ (صحیح مسلم۔ کتاب الایمان)

The Bedouins were somewhat shaky in their Faith, while Islam required the complete submission of one's being to Allah. Here they are being told that they have to prove that Faith had really entered in their hearts, mere utterance of words would not suffice. And they did indeed prove it.

When we say that the world-wide revolution brought about by the Muslims of the First Period was on account of their Faith, we really mean that the change in the angle of their vision effected a radical change in the value and worth of all things in the universe. The Quran demanded this kind of transformation in self to effect external changes in the life and condition of people. This in the Quranic terminology is " تغیرِ نفس " - a radical transformation of character. Many examples of such transformation can be given from the history of earliest Muslim converts in Arabia, who brought about the greatest ideological revolution the world has known.

In the Battles of Baddar and Uhad for instance the Muslim Mujahids and the heathen Quraish were both ready to lay down their lives for their beliefs. But according to the Holy Quran the former were fighting in the name of Allah [فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ] - and the latter in the name of Evil - [فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْت] [4:76]. The difference was in the aim and objective which was indicative of the fact that a great psychological change had taken place in the minds and hearts of the newly converted Muslims. They had decided to replace their old ways with Allah's prescribed way of life. The Quran calls this "change of heart" تغیرِ نفس " and ordains it as an essential pre-requisite for changing the external condition of a people. Rasul Ullah (PBUH) [Messenger of Allah] concentrated on this "essential pre-requisite" for he well knew that without such a "change" he could not achieve the objective of the descent [نزول] of the Holy Quran, or of his Apostleship [بعثتِ رسول]. The question arises: what is this Quranic objective which was Rasul - Ullah's (PBUH) and his Companion's objective of life, and is now the objective of the Muslim Ummah?

(to be continued)

The mere recitation of the "Kalima" is not the acquisition of Faith [ایمان]. The true acquisition of Faith implies a *complete change of heart*. - a creation of an almost entirely new being - a fully developed and powerful instrument in the service of Allah. When one is fully steeped in Faith the very angle of one's vision undergoes a complete change; the path of life and its true destination is firmly determined. The Holy Quran refers to this change in outlook as `transformation of self [تغیرِ نفس].

How forcefully, meaningfully and beautifully has this been described in the Quran in Surah Hujrat [49], verse 14:-

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ

"These Bedouins say "We believe - We have accepted the Faith".

قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا

Say, "No, you have no Faith yet".

وَ لٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا

"You have [Only] submitted to the `System'.

وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ

"For not yet has Faith entered your hearts." (49:14)

However, these transformations or changes of heart pertain to the emotional. The Quran, on the contrary, lays emphasis on the *change of values*. In other words, this change of heart is necessary for the attainment of Quranic values. Allama Iqbal calls it development of 'self' or 'ego' [تعمیرِ خودی], a concept that envelops emotions as well as values. His whole philosophy revolves around this point. He considers man to be the real measure of the essence of all things in the Universe. So he lays the fullest emphasis on the development of 'Self'. He says:-

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

Life is a shell, ego a drop that enters therein.

It's a useless shell that cannot turn the drop into a precious pearl.

What an apt commentary on the life of the Muslims the World over!

In more challenging words the Allama Questions:-

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے — خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں — تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

Why is there no tumult in your heart.

Why is yourself not stormed with Faith?
Why blame the "Moving finger" for what it writes,
Why not your own destiny dictate?

Muslimisation of the Ego

What Allama calls '*Muslimisation*' of the ego [خودی کا مسلمان ہونا] would in the Quranic terminology be "Complete submission of the self to the will of Allah" [اسلام], which is the true implication of Faith [ایمان].

ALLAH'S LAW OF CHANGING CONDITION OF A PEOPLE-3

by

(Izaz D.A.Khan)

Note:- In the last installment (August, 1994) Quranic remedy for ills from which our Nation is suffering was discussed. As stated in the Vesre 11 of surah 13, Allah will never change the condition of a people unless they first change their inner self. It was brought out that Muslims of Pakistan in particular and Muslims of the world in general, in a manner of speaking, have established a front against Allah Himself in trying to effect an external change in our society without first effecting an internal one in our thinking. Unless and until we bring about a radical transformation in our "Self" (Nafs) in the light of Quranic Principles, there can be no improvement in our social conditions. The question discussed in the current installment is what is the literary and scientific meaning of the transformation of "Self" (Nafs). Editor

Transformation of Self [تغییرِ نفس]

The question arises what really is the literary and scientific meaning of this transformation of self. Perhaps a little indulgence in poetic imagery will make the picture clear:-

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں، دنیا مرا دل ہے
بدل جانے سے اس کے رنگ ہر اک چیز کا بدلا!

It dawned upon me at last

The world is nothing but my heart,
When it transforms within,
It transforms all things without.

Or as Akhtar Shirazi puts it:-

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو
کہ جو شے ہے نگاہوں میں حسیں معلوم ہوتی ہے

Whose face was it, after looking at which

All things around were cloaked in its charm